معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/ روپے　　فی شمارہ ۱۲/ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:　　حافظ محمد یحیٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۴　ماہ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۰۴ء　عدد ۴

فہرست مضامین

email: shibli academy @rediffmail. com : ای میل

شذرات

ہندوستان کے مسلمانوں کا مایہ ناز علمی دینی تحقیقی اور تصنیفی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی علامہ شبلیؒ کی زندگی کا بڑا اہم کارنامہ ہے، جس کا فیض قریباً ایک صدی سے جاری ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کو غیر معمولی اور عالم گیر شہرت نصیب ہوئی، اس نے ایسی بلند پایہ اور محققانہ کتابیں شایع کیں جو اپنے بلند معیار اور استناد کی بنا پر نہایت مقبول ہوئیں اور اہلِ علم کے حوالے اور مراجع کا کام دیتی ہیں، اس کے عالمانہ اور صالح لٹریچر نے قوم وملک کا مذاق اور ذہن بنایا، رواج عام اور قوم کا پست مذاق دیکھ کر نہ اس نے اپنا معیار فروتر کیا اور نہ سطحی اور بازار میں چلنے والی کتابیں شایع کیں۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر   شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

دارالمصنفین کے علمی بھکشوؤں کی جماعت نے اسلام، داعی اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر اعتراضات کا مدلل جواب دے کر معترضین کو ساکت ومبہوت کردیا اور اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کے علمی وتمدنی کارناموں کو مسخ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنادیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا ایک امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ اس نے رسوم وظواہر اور نام ونمود کے مروجہ طریقوں سے ہمیشہ احتراز کیا، ہنگاموں اور پروپگنڈوں سے دور رہ کر خاموشی اور انہماک سے علمی خدمت اس کا شعار رہی، نمود ونمائش کے اس دور میں بھی اپنے بانی، اپنے معماروں اور خود اپنے کارناموں کا چرچا کرنے اور انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اپنی نود سالہ زندگی میں اس نے صرف دو بڑی اور اہم تقریبات کیں، ۱۹۶۵ء میں گولڈن جبلی منائی اور ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار کرایا جو اپنے عالمانہ رنگ، وقار اور سنجیدگی کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں، مگر اب سمیناروں کا انعقاد معمول بن گیا ہے، چھوٹے بڑے تمام ادارے سمینار کرا رہے ہیں اور وہ مشاعروں کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں، ہم سے بھی برابر ان کے لیے اصرار کیا جاتا رہا ہے لیکن جو نگاہیں ۶۵ء اور ۸۲ء کے جلوے دیکھ چکی ہیں ان کو یہ سمینار کیا جچیں گے، ہمارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ دارالمصنفین کی مالی حالت تھی، اس کی محدود آمدنی جب اس کے موجودہ مصارف ہی

کے لیے ناکافی ہے تو وہ اضافی اخراجات کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے، اس لیے محض وقتی اور عارضی شہرت کے لیے دارالمصنفین کو کسی مخمصے میں ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ؎

کار از بہر کار باید کرد   از پے واہ ، واہ نتواں کرد
کز پے واہ ، واہ نادانان   زندگانی تباہ نتواں کرد

مگر واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنفین اپنی گوناگوں خدمات اور شاندار کارناموں کے باوجود، شہرت کے موجودہ ذرایع اور عام طریقوں کو اختیار نہ کرنے، اردو ادارہ ہونے اور علمی ذوق روز بہ روز کم ہو جانے کی وجہ سے گوشۂ گم نامی میں جا پہنچا اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے، نئی نسلیں علامہ شبلیؒ اور ان کے عظیم الشان ادارے دارالمصنفین کے کارنامے تو درکنار ان کے نام سے بھی آشنا نہیں ہیں، اس کا اقتضا ہے کہ ان پر سمینار بھی ہو اور ملک وبیرون ملک کی زبانوں میں کتابچے لکھ کر ان کا مسلسل تعارف ہوتا رہے کیوں کہ قومیں اپنے اسلاف کو فراموش کردینے سے خود بھی فراموش ہوجاتی ہیں، اسی درمیان میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے سمینار سے فرار کی گنجایش ہمارے لیے باقی نہیں رکھی اور بے سروسامانی کے باوجود متوکلاً علی اللہ اور دارالمصنفین کے خیر خواہوں اور مخلصین کے بھروسے ایک دوروزہ سمینار کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا جو ۲۸و۲۹/نومبر کو انشاء اللہ ہوگا اور اس کا موضوع اس ذات گرامی کو بنایا گیا جن کے ذہن وتخیل کی پیداوار یہ ادارہ ہے، ان سے نسبت رکھنے والوں اور وابستگانِ دارالمصنفین کی تعداد کثیر ہے اور وہ سب بھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو یاد کیا جائے لیکن ان کے مقابلے میں علامہ شبلیؒ کی وجوہ ترجیح صاف ظاہر ہیں، ان کے بعض تلامذہ پر اعظم گڈھ اور اس کے گردونواح میں سمینار ہوچکے ہیں لیکن علامہ شبلیؒ جن کی نسبت سے اعظم گڈھ کی شہرت چاردانگ عالم میں ہے اور جن کی نسبت سے یہاں کئی ادارے چل رہے ہیں مگر ابھی تک ان پر کوئی سمینار نہیں ہوا تھا، الحمد للہ یہ سعادت دارالمصنفین کے حصے میں آئی اور یقیناً اسی پر ان کا حق بھی سب سے زیادہ ہے، وہ ان کی اصلی اور آخری یادگار ہے، خوشی ہے کہ اس کام میں ان سے منسوب اعظم گڈھ کے تمام ادارے ہمارا پورا تعاون کررہے ہیں۔

علامہ شبلیؒ کی کثیر الجہات اور جامع کمالات شخصیت کا حق ایک سمینار سے ادا نہیں ہوسکتا اور ہم تو اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے ان کے شایانِ شان سمینار کر بھی نہیں سکتے لیکن آدمی اسی کا مکلف

ہے جس کی اس کو وسعت ہے، ظاہر ہے ایک دو روزہ سمینار میں سب کو مدعو کرنا اور مقالہ خوانی کی زحمت دینا ممکن نہیں تھا، دارالمصنفین کا حلقۂ تعارف بہت وسیع ہے لیکن مجبوری اور تنگ دامانی کی بنا پر سمینار کا دایرہ محدود کرنا پڑا، جس کا افسوس ہمیں بھی ہے، دارالمصنفین کے متعدد کرم فرماؤں اور علامہ شبلیؒ کے قدر دانوں سے سمینار میں شرکت اور اس کے مصارف میں تعاون فرمانے کی درخواست کی گئی ہے تاکہ دارالمصنفین زیر بار نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ارادوں کو کامیاب کرے اور ہم نے جو قدم اٹھایا ہے اسے دارالمصنفین کے حق میں مفید اور نافع بنائے، آمین۔

قارئین معارف اور علامہ شبلیؒ کے قدر دانوں کو اس اطلاع سے خوشی ہوگی کہ عرصہ دراز کے بعد دارالمصنفین نے علامہ شبلیؒ کی مشہور ادبی تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' کا نیا، خوب صورت اور محقق و مجلد اڈیشن شایع کیا ہے، ہمارے کرم فرما اور علامہ شبلیؒ کے پایہ شناس عالی جناب سید اکبر علی رضوی (پاکستان) کے گراں قدر عطیے سے اس کی طباعت ہوئی ہے، وہ انشاء اللہ سمینار میں رونق افروز ہوں گے اور ہمیں عزت بخشیں گے۔

ابھی حال ہی میں خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق مشہور شیعی عالم اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے سینیر نایب صدر مولانا ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے ایک بیان دیا تھا، ان جیسے سنجیدہ، باوقار اور قابل احترام شخص سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس طرح کے حساس مسئلے پر بلاضرورت یہ بیان دے کر امت کے انتشار میں اضافے کے موجب بنیں گے، ہمارے خیال میں گو ان کا بیان نامناسب اور بے موقع تھا، جس کو خود ان کے ہم مسلک علما نے بھی پسند نہیں کیا، تاہم اس کی مخالفت میں جو شور و غوغا برپا ہے وہ بھی عاقبت بینی اور تدبر کا ثبوت نہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارکان ہی نہیں وہ لوگ بھی جو انتخابات کے موقع پر بی جے پی کے دام میں جا پھنسے تھے، انہیں اپنی پوزیشن بحال کر لینے کا ایک بہانہ مل گیا ہے، میڈیا تو اسی طرح کے مواقع کی تاک میں رہتا ہے، وہ بھی مسلم عورتوں کا ہمدرد و غمگسار اور مسلمانوں کی پس ماندگی سے بے چین و بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن ہم کو افسوس ہے کہ اس ''دردمند گروہ'' کو سامنے لانے اور امت کی رسوائی و بدنامی کرانے والے ہمارے اپنے ہی رہبر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

مقالات

احادیث عاشوراء: ایک درایتی تجزیہ

از:- پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ☆

(۲)

اہل مدینہ کو روزۂ عاشوراء کا حکم نبویؐ

روزۂ عاشوراء رکھنے کے عمومی حکم نبویؐ کے علاوہ بعض احادیث نبویؐ ایسی ملتی ہیں جن میں انصار کے بعض طبقات کو بالخصوص مدنی طبقات کو اس اسلامی روزہ رکھنے کا حکم ملتا ہے اور بعض احادیث قرب و جوار کے مدنی قبایل و طبقات کے حکم نبویؐ کی خصوصی صراحت کرتی ہیں، ان احادیث نبویؐ کو ہم دو طبقات میں منقسم کر سکتے ہیں: ۱-خاص مدینہ والوں کے لیے حکم، ۲-مدینہ کے قرب و جوار میں آباد انصاری بستیوں کے لیے امر نبویؐ، ان دونوں میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے سب کو روزۂ عاشوراء رکھنے کا واجب حکم دیا تھا، جن لوگوں نے پہلے رکھ لیا تھا ان کو تعمیل کی سعادت ملی تھی اور جنہوں نے نہیں رکھا تھا ان کو باقی دن کا روزہ رکھنے اور کھانے پینے سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ حکم روزۂ عاشوراء کی فرضیت ثابت کرتا ہے اور اس کا یہودی روایت سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔

حضرت محمد بن صیفی انصاریؓ کی روایت ہے کہ عاشوراء کے دن رسول اکرمؐ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا تم لوگوں نے آج کا روزہ رکھا ہے؟ بعض لوگوں نے کہا، ہاں اور بعض لوگوں نے کہا نہیں، آپؐ نے نہ رکھنے والوں سے فرمایا کہ تم لوگ باقی دن کا روزہ پورا کرو اور ان کو یہ بھی حکم دیا کہ تمام عروض کے باشندوں کو آج کے دن کا روزہ پورا کرنے کا حکم پہنچاؤ:

(۲۳۳) عن محمد بن صیفی الانصاری ؓ قال: خرج علینا رسول اللہ ﷺ

☆ ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ۔

وعلی آلہ وصحبہ وسلم یوم عاشوراء، فقال: اصمتم یومکم ھذا؟ فقال بعضھم: نعم، وقال بعضھم: لا، قال: فاتموا بقیۃ یومکم ھذا وامرھم ان یؤذنوا اھل العروض ان یتموا یومھم ذلک۔ (مسند احمد، الساعاتی ۱۸۰/۱۰، نیزابن ماجہ، سنن، باب صیام یوم عاشوراء، حدیث: ۱۷۳۵، ۵۵۲، نیز الزوائد میں بقول محقق محمد فواد عبدالباقی)

(۱۲۵) (۱۱۲۸) حدثنا ابو بکر بن ابی شیبۃ حدثنا عبید اللہ بن موسی اخبرنا شیبان عن اشعث بن ابی الشعثاء عن جعفر بن ابی ثور عن جابر بن سمرۃ ﷺ قال: کان رسول اللّٰہ یامرنا بصیام یوم عاشوراء، ویحثنا علیہ ویتعاھدنا عندہ ...... الخ ۔ (مسلم، نووی ۲۰۲/۲)

ایک دوسرے مدنی صحابی حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ ہم کو عاشوراء کے دن کے روزے کا حکم دیتے تھے اور اس پر ابھارتے تھے اور اس پر اپنے حضور عہد لیتے تھے۔

ان دونوں احادیث سے بالخصوص اور بعض دوسری احادیث سے بالعموم یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے مختلف مدنی طبقات انصار کے پاس خود تشریف لے جاکر ان کو خاص عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور یہاں تک اصرار فرمایا تھا کہ جس نے نہیں رکھا وہ باقی دن کا روزہ رکھے، ظاہر ہے کہ یہ حکم نبویؐ اس کی فرضیت کی دلیل ہے، ان دونوں صحابی راویوں کا تعلق دو مختلف طبقات یا بطون انصار سے تھا، حضرت جابر بن سمرہؓ اور رسول اکرمؐ بہ طور خاص کم از کم حضرت محمد بن صیفی انصاری کے قبیلے کے پاس یہ حکم پہنچانے تشریف لے گئے تھے، اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ بہ نفس نفیس عاشوراء کے دن جہاں جہاں جاسکتے تھے روزہ رکھنے کا حکم پہنچایا تھا اور جہاں آپؐ تشریف نہیں لے جاسکتے تھے، آپؐ نے اپنے انصاری مدنی مخاطبین کو پابند بنایا تھا کہ وہ آپؐ کا حکم قرب وجوار کے علاقوں تک پہنچادیں، حضرت محمد بن صیفی انصاری کی روایت کردہ حدیث میں لفظ ''اھل العروض'' سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

جامع ومرتب مسند احمد شیخ ساعاتی نے صاحب النہایہ کا قول وشرح نقل کیا ہے کہ اہل العروض سے مراد مکہ ومدینہ اور ان دونوں کے اردگرد کے علاقے ہیں اور ایک روایت کے مطابق مکہ

مدینہ اور یمن کو ''العروض'' کہا جاتا ہے: ''...... یطلق علی مکۃ والمدینۃ وما حولھما من البلدان المجاورۃ لھما، قال صاحب النھایۃ، یقال لمکۃ والمدینۃ والیمن العروض''، اگر یمن کو بھی عروض میں شریک وشامل نہ کریں تو حرمین شریفین اور ان کے اردگرد کی بستیاں تو اس میں شامل تھیں ہی اور ان سب کے اہل ایمان کو روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم نبویؐ دیا گیا تھا اور مدنی مخاطبوں کو پابند بنایا گیا تھا کہ ان کو بھی اس فرض کے ادا کرنے کا حکم نبویؐ پہنچادیں، ظاہر ہے کہ اہل مکہ کے مسلمین اس سے پہلے سے واقف تھے اور مدینہ کے باخبر لوگ بھی اس فرض پر عامل تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کے فرمان واستفسار کے وقت پہلے سے روزہ رکھے ہوئے تھے اور جن لوگوں نے تساہل برتا تھا ان کو روزہ پورا کرنے کا حکم مزید دیا اور دوسرے باخبر لوگوں کو سفیر بنا کر بے خبروں کو اس حکم سے واقف اور اس پر عمل کرانے کے لیے بھیجا۔

شہر مدینہ کے قرب وجوار کے لیے حکم نبوی ﷺ

صوم عاشوراء کے عمومی حکم اور اہم مدینہ کے لیے خاص امر نبویؐ کے علاوہ قرب وجوار کی انصاری بستیوں کے لیے مخصوص ترین حکم کا ذکر بعض احادیث نبویؐ میں ملتا ہے جو اسلامی روزۂ عاشوراء کی کم از کم تین مدنی جہات وحدود واطراف کو پیش کرتا ہے، امام مسلم کی صحیح میں بالخصوص ایسی دو احادیث بیان کی گئی ہیں اور ان کی سندی اہمیت یہ ہے کہ وہ ایک مدنی خزرجی خاتون صحابیہ کی سند پر مروی ہیں، اور وہ نہ صرف اس حکم نبویؐ کی حافظہ و ناقلہ ہیں بلکہ اپنے اور اپنے خاندان کے لوگوں بالخصوص بچوں / بچیوں کی اس اسلامی فرض پر عمل آوری کرانے کی بھی راویہ ہیں، اصل حدیث مسلم (۱۳۶) (۱۱۳۶) ہے اور (۱۳۷) اس کی متابع۔

(۱۳۶) (۱۱۳۶) وحدثنی ابو بکر بن نافع العبدی حدثنا بشر بن المفضل بن لاحق حدثنا خالد بن ذکوان عن الربیع بنت معوذ بن عفراء، قالت: ارسل رسول اللّٰہ ﷺ غداۃ عاشوراء الی قری الانصار حول المدینۃ: من کان اصبح صائما فلیتم صومہ ومن کان اصبح مفطرا فلیتم بقیۃ یومہ فکنا بعد ذلک نصومہ ونصوّم صبیاننا الصغار منھم ان شاء اللّٰہ ونذھب الی المسجد فنجعل لھم اللعبۃ من العھن فاذا بکی احدھم علی الطعام اعطیناھا ایاہ عند الافطار۔

(۱۳۷) وحدثنا یحیی بن یحیی حدثنا ابو معشر العطار عن خالد بن

ذکوان قال: سألت الربیع بنت معوذ عن صوم عاشوراء، قالت: بعث رسول اللہ ﷺ رسلہ فی قری الانصار فذکر بمثل حدیث بشر غیر انہ قال: ونصنع لھم اللعبة من العھن فنذھب بہ معنا فاذا سألونا الطعام اعطیناھم اللعبة تلھیھم حتی یتموا صومھم۔ (مسلم، نووی ۲/۲۰۶-۲۰۷)

ان دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے عاشوراء کی صبح اپنے بعض سفیروں کو مدینہ کے اردگرد کی انصاری بستیوں کی طرف یہ حکم دے کر بھیجا کہ جس نے صبح سے روزہ رکھ لیا وہ اپنا روزہ پورا کرے اور جس نے صبح کچھ افطار کر لیا یعنی کھا پی لیا وہ باقی دن کا روزہ پورا کرے، اس حکم کے بعد اس کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اپنے نابالغ چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھوایا کرتے تھے، جس جس کو اللہ رکھوانا چاہتا تھا اور گھر سے اون کے کھلونے بنا کر مسجد لے جاتے تھے اور وہاں بچے جب کھانے کے لیے روتے تو ان کو کھلونے دے کر بہلاتے تھے تا آنکہ ان کا روزہ پورا ہو جاتا اور افطار کا وقت آجاتا، اتنی تاکید صرف فرض روزے کی ہو سکتی ہے، حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ بڑی محترم صحابیات میں سے تھیں جو شریک جہاد ہوتیں اور فوجی خدمات انجام دیا کرتی تھیں۔

عام ساکنانِ شہر نبوی اور مخاطبین حکم نبوی نے رسول اکرمؐ کا حکم روزۂ عاشوراء قرب و جوار کے لوگوں کو تو پہنچایا ہی تھا مگر رسول اکرمؐ نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ فرض اسلامی روزہ کی اہمیت و فرضیت اجاگر کرنے کا معاملہ تھا، آپؐ نے اس اسلامی فرض کی تبلیغ و ترسیل اور اس پر عمل درآمد کرانے کے لیے خاص سفیروں کو مقرر کر کے مختلف بستیوں کو بھیجا، سفرائے نبویؐ کی تعداد تین سے اوپر اور دس تک بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ جمع کا تقاضا ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ بستیوں کی تعداد کے مطابق رہی تھی، ان خاص سفیروں (رسل) کے ذریعہ وہی تاکیدی حکم روانہ فرمایا کہ جس نے روزہ رکھ لیا وہ تو پورا کرے ہی لیکن جس نے غلطی سے صبح کو کھا پی لیا ہے وہ باقی دن کے لیے روزہ رکھے اور شام کو ہی افطار کرے، اس طرح روزۂ عاشوراء کی فرضیت کا اثبات فرمایا، صحابہ کرام اور صحابیات عالیہ کا حال یہ تھا کہ انہوں نے روزۂ عاشوراء رکھا اور اپنے نابالغ بچوں اور بچیوں کو بھی رکھوایا تا کہ ان پر فرضیت عاشوراء کا حکم واضح ہو جائے، حدیث مسلم میں یہ نکتہ اہم ہے کہ چھوٹے بچوں، بچیوں کو

اپنے اپنے گھروں سے باہر مسجد میں لے جایا گیا کیوں کہ گھر پر وہ رہتے تو کھانے کے مطالبہ پر عذر کی گنجایش نہیں رہ جاتی، مسجد میں وہ گھروں سے دور ہونے کے سبب بچے بھی سمجھ جاتے کہ وہاں کھانا کہاں؟ وہ تو گھر پر ملے گا، ان کی بھوک بہلانے اور کھانے کی طرف سے غافل کرنے کے لیے خواتین نے خالص نسائی نفسیات سے کام لیا کہ ان کے لیے اون کے چھوٹے چھوٹے کھلونے بنا لیے، جب وہ بھوک سے بے تاب ہو کر کھانا مانگتے تو ان کو ان کھلونوں سے بہلا دیا جاتا اور وہ کھیل میں مشغول ہو کر بھوک اور کھانا بھول جاتے اور شام تک اپنے روزے پورے کر لیتے۔

روزۂ عاشوراء کی فرضیت ثابت کرنے کے لیے رسول اکرمؐ کا اتنا اہتمام خاص اپنے شہر والوں کے لیے تھا اور اسی کے ساتھ اردگرد کی انصاری بستیوں کے لیے بھی تھا، ان میں ان بستیوں (قری) کا ذکر نہیں ہے اور امام نووی وغیرہ نے ذکر بھی نہیں کیا ہے لیکن قباء جیسی قریبی انصاری آبادی کو ان میں شامل سمجھنا چاہیے اور وہ قریبی بستیاں شہر خاص کے اردگرد ہر طرف پائی جاتی تھیں، ان بستیوں کی تعیین سے حکم نبویؐ کی اہمیت مزید اجاگر ہو جائے گی مگر اصل مسئلہ یہ ہے جو ثابت ہو چکا کہ روزۂ عاشوراء کی فرضیت ثابت کرنے اور انصاری مسلمانوں کو اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے رسول اکرمؐ نے خاص الخاص اہتمام کیا تھا، مسند احمد کی حدیث: ۲۳۶ بہ روایت حضرت عبد اللہ سے اس کی تصدیق مزید ہوتی ہے، رسول اکرمؐ کا حکم روزہ سن کر بنو عمرو بن عوف کے ایک شخص نے کہا کہ میں نے اپنی قوم کو جب چھوڑا تو کچھ روزہ سے تھے اور کچھ بلا روزہ، رسول اکرمؐ نے انہیں بھیجا کہ اپنی قوم کو حکم پہنچائیں۔

۲۳۶: عن بعجة بن عبد اللہ ان اباہ اخبرہ ان رسول اللہ ﷺ قال لھم یوما: ھذا یوم عاشوراء فصوموا فقال رجل من بنی عمرو بن عوف: یا رسول اللہ! انی ترکت قومی منھم صائم ومنھم مفطر فقال النبی ﷺ: اذھب الیھم فمن کان منھم مفطرا فلیتم صومہ۔ (مسند احمد، الساعاتی ۱۰/۱۸۲)

بدوی قبایل کو روزۂ عاشوراء کا حکم

صیام عاشوراء سے متعلق ایک طبقہ احادیث نبوی خالص بدوی قبایل عرب کو فرض و حکم اسلامی کا پابند بناتا ہے، صحیحین، مسند احمد اور بعض دوسری احادیث کی کتب معتبرہ میں بعض بدوی قبایل اور قرب و جوار کے لوگوں میں اس حکم نبویؐ کی اشاعت کا ذکر ملتا

ہے، شارحین حدیث نے اور فقہائے امت نے ان پر کلام کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ تاکیدی حکم نبوی ایک فرض کو ادا کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور حدیث کے متون بھی اسی کو ثابت کرتے ہیں، لہذا پہلے ان تمام متون احادیث نبوی کو ان کی اسانید کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، پھر شارحین کرام اور علمائے اسلام کے مباحث سے تعرض کیا جائے گا اور پھر مجموعی حیثیت سے ان کی نوعیت پر گفتگو ہوگی۔

۲۰۰۷- حدثنا المکی بن ابراھیم حدثنا یزید بن ابی عبید عن سلمة بن الاکوع قال: امر النبی ﷺ رجلا من اسلم ان اذن فی الناس ان من اکل فلیصم بقیة یومه ومن لم یکن اکل فلیصم فان الیوم یوم عاشوراء۔ (بخاری، فتح الباری، ۳۱۰/۴ومابعد)

(۱۳۵)(۱۱۳۵): حدثنا قتیبه بن سعید حدثنا حاتم یعنی ابن اسماعیل عن یزید بن ابی عبید عن سلمة بن الاکوع قال: بعث رسول ﷺ رجلا من اسلم یوم عاشوراء فامره ان یوذن فی الناس من کان لم یصم فلیصم ومن کان اکل فلیتم صیامه الی اللیل۔ (مسلم، نووی ۲۰۶/۲)

(۲۳۲) عن سلمة بن الاکوع ان النبی ﷺ امر رجلا من اسلم ان یوذن فی الناس یوم عاشوراء: من کان صائم فلیتم صومه ومن کان اکل فلا یاکل شیئا ولیتم صومه۔

(۲۳۴) عن ھند بن اسماء قال: بعثنی رسول اللّٰه ﷺ الی قومی من اسلم فقال: مُر قومک فلیصوموا ھذا الیوم یوم عاشوراء فمن وجدته منھم قد اکل فی اول یومه فلیصم آخره۔

(۲۳۵) عن یحیی بن ھند عن اسماء بن حارثة ان رسول اللّٰه ﷺ بعثه فقال: مرقومک بصیام ھذا الیوم قال: أرایت ان وجدتھم قد طعموا قال: فلیتموا آخر یومھم (ومن طریق ثان) زعن اسماء بن حارثة ان رسول اللّٰه ﷺ بعثه فقال: مرقومک فلیصوموا ھذا الیوم قال: أرایت ان وجدتھم قد طعموا؟ قال: فلیتموا بقیة یومھم۔ (مسند احمد، الفتح الربانی/

الساعاتی، ۱۷۹/۱۰-۱۸۱)

۲۴۴۴- حدثنا محمد بن المنھال اخذنا یزید بن زریع اخبرنا سعید عن قتادة عن عبد الرحمن بن مسلمه عن عمه: ان اسلم اتت النبی ﷺ فقال: صمتم یومکم ھذا؟ قالوا: لا قال: فاتموا بقیة یومکم واقضوا قال ابو داؤد: یعنی یوم عاشوراء۔ (ابو داؤد، سنن، باب فی فضل صومه، ۴۱۷)

(۲۳۱) عن ابن عباس قال: ارسل رسول اللّٰه ﷺ الی اھل قریة علی راس اربعة فراسخ او قال: فرسخین یوم عاشورا، فامر من اکل ان لا یاکل بقیة یومه ومن لم یاکل ان یتم صومه۔ (مسند احمد، الساعاتی، ۱۷۹/۱۰)

اگرچہ حدیث مسند احمد سے اہل العروض یعنی مکہ و مدینہ کے اردگرد آباد مسلمان بستیوں کے لوگوں کو روزۂ عاشوراء کا حکم نبوی پہنچانے کا عام حوالہ آچکا ہے، تاہم رسول اکرمؐ نے خاص قبایل کے لیے اپنے خاص سفیروں کو بھی اسی حکم کے ساتھ روانہ کیا، حضرت سلمہ بن الاکوع اسلمی کی سند پر مسند احمد اور صحیحین کی احادیث مروی ہیں جن کا مفہوم ہے کہ رسول اکرمؐ نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص کو "لوگوں" (الناس) میں اعلان کرنے اور حکم نبوی پہنچانے کے لیے بھیجا مگر اس سفیر اسلمی کا نام نامی نہیں بیان کیا گیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے "باب اذا نوی بالنہار صوما" میں حدیث حضرت سلمہ پر بحث کرتے ہوئے اس گمنام سفیر نبوی کی تعیین کی ہے اور وہ امام احمد بن حنبل کی بیان کردہ احادیث: ۲۳۴-۲۳۵ کی بنیاد پر کی ہے کہ ان سے مراد حضرت ہند بن اسماء بن حارثہ اسلمی ہے، (فتح الباری، ۱۸۰/۴-۱۸۲: بقیہ بحث روزے کی رات میں نیت کرنے کی شرط سے متعلق ہے جیسا کہ عنوان باب سے ظاہر ہے، صوم عاشوراء پر مختصر بحث ہے) مزید تفصیلات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت ہند اسلمی اصحاب حدیبیہ میں سے تھے اور ان کے بھائی بھی صحابی تھے اور ان کو اپنی قوم اسلم کو عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم نبوی پہنچانے کے لیے بھیجا تھا، بعض روایات مسند میں آتا ہے کہ ان کے والد حضرت اسما اسلمی کو بھی بھیجا گیا تھا، اس بنا پر حافظ موصوف

کا تطبیقی رجحان یہ ہے کہ فرزند و پدر دونوں کو بھیجا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف ایک کو بھیجا گیا
کہ دونوں راویوں کی روایت ایک ہو، بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم قبیلہ اسلم کے لیے
ایک خاص سفیر نبوی مدینہ سے بھیجا گیا تھا، دوسرے شارحین کرام نے حافظ موصوف کی تشریح ہی
کی پیروی کی ہے۔

لیکن ان دونوں روایات کا متن الگ الگ ہے، حضرت سلمہ اسلمی اس اسلمی سفیر کے نام
سے واقف تھے، لہذا وہ اس کا نام لے سکتے تھے کسی وجہ سے نہیں لیا، وہ بہر حال ایک دوسرے شخص
بھی ہو سکتے تھے، کیوں کہ ان لوگوں کو حکم پہنچانے کے لیے بھیجا گیا تھا جن میں اسلم کے علاوہ
دوسرے لوگ بھی بالخصوص غفار کے لوگ شامل ہو سکتے تھے کیوں کہ یہ دونوں بدوی قبیلے پڑوسی ہی
نہیں ایک دوسرے کے حلیف و دوست بھی تھے۔

قبایل اسلم و غفار مکہ۔مدینہ کی شاہ راہ تجارت و سفر کے اردگرد کافی مسافت پر آباد تھے اور
غالباً وہ دونوں حرمین شریفین کے وسط میں مختلف قریات اور بستیوں میں آباد تھے، ان کے تمام افراد
و طبقات کو حکم نبوی پہنچانے کے لیے یا عام حکم نبوی عام کرنے کے لیے کئی منادیوں کی ضرورت تھی،
لہذا یہ عین ممکن ہے بلکہ قوی قرینہ رکھتا ہے کہ حضرت ہند اسلمی اور ان کے والد حضرت اسماء بن
حارثہ اسلمی کو خاص ان کی قوم اسلم کے لیے بھیجا گیا ہو اور تیسرے گمنام سفیر نبوی کو ان کے بعد
دوسرے لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہو۔

اسی کے ساتھ "الناس" (لوگوں کو) باخبر کرنے کے فقرے سے ایک اور قوی امکان کا قرینہ
نکلتا ہے، ظاہر ہے کہ رسول اکرمؐ کے سفرائے کرام روزۂ عاشوراء کی فرضیت اور اس پر عمل درآمد
کرانے کا حکم نبوی لے کر جا رہے تھے، وہ خاص اسلم کے لیے بھیجے بھی گئے تھے مگر اس کا یہ مفہوم تو نہیں
کہ انہوں نے مدینہ منورہ سے علاقہ اسلم کے علاقے تک چپ سادھ رکھی تھی اور راستے کے مسافروں
اور دوسری مسلم بستیوں کے لوگوں کو رسول اکرمؐ کے حکم فرض سے بے خبر رکھا تھا، یہ منطقی طور سے
ممکن نہیں اور نہ ہی اسلامی روایت کے لحاظ سے، لہذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع
اسلمی کی روایت میں الناس سے مراد صرف قبیلہ اسلم نہیں بلکہ "مسلمین" ہیں خواہ وہ اسلم قبیلہ کے
ہوں، غفار کے ہوں یا دوسرے کوئی اور حضرات۔ہند و اسماء اسلمی نے بطور خاص اپنی اپنی قوم اسلم

تک حکم نبوی پہنچایا تھا اور ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی دوسروں کو اس سعادت سے محروم نہیں رکھا تھا،
وہ خاص علاقے کے لیے سفیر بنائے گئے تھے لیکن عام اسلامی حکم لے کر جا رہے تھے۔

اس طبقۂ احادیث میں آخری حدیث حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے
چار یا دو فرسخ پر آباد ایک بستی کے لوگوں کے پاس اپنے سفیر کے ذریعہ یہی حکم بھیجا تھا کہ جن لوگوں
نے افطار کر رکھا ہو وہ عاشوراء کا بقیہ روزہ رکھیں، شیخ ساعاتی نے فرضیت عاشوراء، اہتمام نبوی اور
اس حدیث کی تخریج، ہیثمی، طبرانی کی کبیر کا ذکر کیا ہے لیکن اس قریہ کی تعیین نہیں کی، بہر حال تعیین
ہو یا نہ ہو یہ حدیث مزید ثابت کرتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے قرب و جوار کے کسی قریے اور آبادی کو
نہیں چھوڑا تھا جہاں یہ حکم روزہ نہ پہنچایا ہو، اس حدیث اور اس کے طبقہ سے بالخصوص یہ اہم نکتہ
ثابت ہوتا ہے کہ روزہ عاشوراء کا فرض پورے علاقے نافذ کیا گیا ہے اور قرب و جوار کی تمام
بستیوں کو اس حکم سے واقف کرایا گیا تھا، اتنا اہتمام آخر کس لیے تھا اور کس سبب سے؟۔

یہودی سنتِ عاشوراء

متعدد احادیث نبوی میں یہودی سنت عاشوراء کا ذکر ملتا ہے، اس کا ایک دینی اور تہذیبی
پس منظر ہے، یہودی روایات و افکار کے مطابق حضرت موسیٰ کو اس یوم سعید میں فرعون اور اس کے
مظالم سے نجات ملی تھی، اس کے شکرانے میں حضرت موسیٰ نے اس دن کا روزہ رکھا اور ان کی پیروی
میں کم از کم یہودانِ عرب نے بھی روزہ عاشوراء رکھا، اور دو شہروں مدینہ منورہ اور خیبر کے یہودیوں
کے روزۂ عاشوراء رکھنے کا ذکر احادیث مسلم وغیرہ میں پایا جاتا ہے، اس کا قوی امکان ہے کہ دوسری
یہودی بستیوں میں بھی اس سنت موسوی پر عمل ہوتا رہا تھا اور وہ ایک قومی روایت بن گئی تھی۔

شارحین حدیث اور دوسرے اہل علم و فکر نے صیام عاشوراء کے اس یہودی پس منظر اور دینی
وجہ کو قبول کر لیا، اس کے قبول کرنے میں کوئی ظاہری مانع نہیں ہے کیوں کہ حدیث صحیح میں یہی پس منظر
اور سبب و عامل بیان کیا گیا ہے لیکن اس پر کسی کی نظر نہیں گئی کہ یہ بیان "یہودیوں" کا ہے جن کی
دینی تحریفات، تہذیبی و سماجی انحرافات پر تاریخ شاہد ہے، عین ممکن ہے کہ یوم عاشوراء حضرت موسیٰ
اور امت موسوی کے فرعونی مظالم سے نجات کا دن بھی رہا ہو اور حضرت موسیٰ نے اس کا روزہ رکھا
ہو اور ان کی امت نے اس کو موسوی اور یہودی سنت بنا دیا ہو حالاں کہ حقیقت یہی نہ تھی۔

امام قرطبی، حافظ ابن حجر، امام ابن رسلان اور دوسرے علما و مفکرین اسلام کی سابقہ تشریحات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ماہ کے تین دنوں کے روزے اور عاشوراء کا روزۂ سالانہ یہودی اور عیسوی شریعتوں سے بہت پہلے سے چلا آرہا تھا، بعض روایات کے مطابق حضرت نوحؑ کے زمانے سے اور کثیر روایات وتشریحات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں وہ رائج تھا بلکہ قریشِ مکہ اور دوسرے عرب اور سب سے بڑھ کر رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرام اسے بعثت سے قبل رکھتے چلے آرہے تھے، لہٰذا وہ ملت حنفی اور شریعت ابراہیمی کا ایک فریضہ تھا جس پر مسلمانوں کے علاوہ دوسرے آسمانی مذاہب کے لوگ بھی عامل تھے، اسی فرضیت روزہ عاشوراء کے سبب رسول اکرمؐ نے مدینہ منورہ آنے کے بعد پہلے آنے والے محرم میں اس کو بہ طور اسلامی روزہ رکھا تھا اور دوسرے تمام مدینہ اور مکہ اور ان کے قرب وجوار کے مسلمان دیہاتوں کے لوگوں کو اس فریضہ کے ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔

ایک اہم فقہی پس منظر بھی اس روزہ عاشوراء کے ضمن میں ابھرتا ہے جس کی طرف نظر سرے سے گئی ہی نہیں، حضرت موسیٰؑ کا روزہ بہ طور شکرانہ بیان کرنے کا یہودی نظریہ مان بھی لیا جائے تو وہ خالص سنت ومستحب ہی ٹھہرے گا، فرض وواجب نہیں بن سکے گا کہ اس کی تشریع قانون الٰہی نے نہیں کی تھی اور اس کے وجوب کا حکم نبی مکرمؐ نے بھی نہیں دیا تھا، جبکہ اسلامی روزۂ عاشوراء فرض وواجب تھا اور مسلمانوں کے لیے رسول اکرمؐ کے حکم دینے کے سبب اس پر عمل ضروری بن گیا تھا، قطعِ نظر اس حقیقت ثابتہ سے کہ روزہ عاشوراء شریعت موسوی میں ملت حنفی سے بہ طور فریضہ اسلامی منتقل ہوا تھا۔

اس فقہی اور اصولی پس منظر کے علاوہ تاریخی اور زمانی پس منظر سے بھی بحث کرنی بہت ہی ضروری ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی اور بعض دوسرے شارحین حدیث اور علمائے اسلام نے اس سے مختصر طور پر تعرض کیا بھی ہے، اس سوال کے ذریعہ کہ رسول اکرمؐ کو یہودی شکرانہ کے روزۂ عاشوراء کا علم کس وقت ہوا؟ بحث کا آغاز کیا گیا ہے، حافظ موصوف کا خیال ہے کہ رسول اکرمؐ کو ربیع الاول ۱ھ سے اگلے محرم تک اس کا علم غالباً نہیں ہوسکا تھا کیوں کہ اس وقت تک یوم عاشوراء کے روزے کے یہودی نظریہ کا سوال ہی نہیں اٹھا تھا، ہجرت کے لگ بھگ دس گیارہ ماہ بعد وہ

معلوم ہوا۔

یہودی روزۂ عاشوراء سے متعلق احادیث نبوی کے متون واضح کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے یہود مدینہ کو روزۂ عاشوراء رکھتے دیکھا تو ان سے اس کی بابت سوال فرمایا اور یہودی بیان سے جانا کہ وہ شکرانے کا نفلی روزہ ہے، تب آپؐ نے حضرت موسیٰ سے اپنی نسبت نبوی اور مسلمانوں کی شرعی ودینی نسبت کی افضلیت جتائی اور خود بھی روزہ عاشوراء رکھا اور اس کے روزوں کا حکم بھی دیا، یہ تمام احادیث نبوی کے مجموعی بیان کا نتیجہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اگرچہ بعض روایات و احادیث میں مدینہ آنے کے بعد ہی یہودیوں کو عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھنے کا ذکر ملتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ اسی دن دیکھا ہوگا جس دن رکھا گیا تھا، یہ حضرت موسیٰ کی نسبت سے روزہ رکھنے کا واقعہ ہے جو شریعت اسلامی کے اتحاد واتفاق اور اس کے تسلسل وتعامل کی علامت ہے لیکن یہاں ایک دوسری مشکل کا سامنا ہے اور وہ فقہی ولازمی حکم اسلامی اور نفلی اور شکرانے کے روزے میں تصادم کا قضیہ ہے جس پر بحث نہیں کی گئی۔

تمام صحیح احادیث نبوی اور شارحین کرام کی تشریحات اور علما وفقہا کے نظریات سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرام مکی دور سے عاشوراء کا روزہ ایک اسلامی فریضہ کی حیثیت سے رکھتے چلے آرہے تھے اور وہ رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے تک فرض رہا تھا، یعنی شعبان ۲ھ میں جب صیام رمضان کے احکام اترے تو روزہ عاشوراء کی فرضیت منسوخ ہوئی اور اس کی جگہ رمضان کے روزے فرض ہوگئے اور تب روزہ عاشوراء مسنون ومستحب بن گیا، فرض نہیں رہا، یہاں ایک حکم اور اصول سے مختصر بحث بھی کرلی جائے، مکی شریعت اسلامی یا بہتر وواضح طور سے شریعت محمدیؐ میں روزہ فرض تھا جس طرح نماز فرض تھی، بحث نماز کے اوقات وہیئات یا تعداد رکعات سے نہیں کہ وہ اصل حکم کی فروع اور شاخیں ہیں، اصل حکم فرضیت نماز کا ہے خواہ ایک وقت کی ہو یا دو وقت کی یا پانچ وقت کی اور ان کی رکعات دو ہوں یا تین یا چار ہوں، اسی طرح روزہ فرض تھا اور وہ روزہ خواہ ایک دن کا ہو یا چالیس دن کا یا پچاس دن کا جیسا کہ یہودی ومسیحی شریعتوں میں تھا، اصل حکم روزہ رکھنے کا ہے، تعداد روزہ اور اس کے ایام اصل حکم نہیں ہیں، وہ حکم فرضیت ووجوب کی فروع اور توسیع ہیں، پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اگر

تعداد روزہ کو ملحوظ رکھا جائے تو روزۂ عاشوراء کے ساتھ ہر ماہ کے تین روزے بھی فرض تھے، اس طرح کم از کم چھتیس روزے سال بھر میں فرض تھے اور ان پر زاید روزۂ عاشوراء تھا یعنی کل سینتیس روزے سالانہ احادیث و روایات اور علمائے کرام کے آرا میں رمضان المبارک کے تیس روزوں کی فرضیت سے روزہ عاشوراء کے فرض ہونے کا تو خوب ذکر ملتا ہے لیکن ابھی تک ہر ماہ کے تین روزوں یعنی سالانہ (بارہ ماہ کے) چھتیس روزوں کی فرضیت کے منسوخ ہونے کا کہیں حوالہ تک نہیں مل سکا، ماہانہ تین روزوں کی فرضیت کو نظر انداز کرنے کی وجوہ وعوامل صرف یہی ہیں کہ ان پر نظر نہیں گئی، اصل حکم یعنی "فرضیت روزہ" کا ایک اور پہلو بھی بہت اصولی اور ضروری ہے اور اس پر بھی مختصر سی توجہ دلانی ضروری ہے، درحقیقت اصل حکم یعنی "فرضیت روزہ" ہمیشہ برقرار رہا اس کی حیثیت و منزلت میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ وہ بدلا گیا تھا جو چیز منسوخ ہوئی وہ ایک خاص زمانے یا دنوں یا دن کے روزوں کی فرضیت منسوخ ہوئی تھی، روزۂ عاشوراء کی جگہ رمضان کے روزوں نے لے لی تھی، فرضیت روزہ کا اصولی حکم غیر مبدل تھا اور ہمیشہ رہا، ایام روزہ میں تبدیلی کو نسخ سے تعبیر کیا گیا۔

اس اصولی بحث، فرضیت روزہ کے اصل حکم اور مکی دور بالخصوص رمضان کے روزوں کی فرضیت کے اہم امور کی روشنی میں یہودی روزۂ عاشوراء اور اس کی پیروی اسلامی واتباع و امر نبوی کا نہ مطالعہ کیا گیا اور نہ ہی تجزیہ کیا گیا ہے، رمضان ۲ھ یعنی ہجرت مدینہ کے اولین سترہ ماہ تک روزہ عاشوراء مسلمانوں پر فرض تھا، رسول اکرمؐ نے بہ نفس نفیس کی و دوسرے مہاجرین صحابہ اور مدنی اہل اسلام نے اس کو فرض سمجھ کر رکھا اور جن مدنی مسلمانوں کو یہودی روایت کے پس منظر سے یا کسی اور وجہ سے بالخصوص فرضیت روزہ عاشوراء سے ناواقفیت و تساہل سے غلط فہمی ہوگئی تھی، ان سے امر خاص کے روزہ عاشوراء رکھوایا گیا اور تمام اسلامی بستیوں میں اس اسلامی فریضہ کی بجا آوری کے لیے خاص الخاص اہتمام کیا گیا، لہذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور تمام اہل اسلام مدینہ منورہ کے قیام کے اولین ماہ محرم میں روزہ عاشوراء یہودی روایت و موسوی سنت کی پیروی میں نہیں رکھا تھا، اسے بطور اسلامی روزہ اور سابقہ اسلامی دستور کے مطابق رکھا گیا تھا۔

رمضان ۲ھ کے روزوں کے فرض ہونے کے بعد ہی رسول اکرمؐ کی گفتگو یہودی طبقات

وعلمائے مدینہ سے یوم عاشوراء کے روزے کی بابت ہوئی تھی، یعنی درایت کی بنیاد پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان یہودی صیام عاشوراء سے متعلق احادیث نبوی بالخصوص نفل و شکرانہ کے روزہ عاشوراء رکھنے کا معمول نبوی اور مسلمانوں کو اس کے روزے رکھنے کا حکم نبوی در اصل محرم ۳ھ کے قریبی زمانے کا ہے یعنی روزہ رمضان کی فرضیت کے بعد، مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ اس موسوی سنت کی پیروی کریں لیکن اس حکم نبوی میں وجوب و فرضیت کا عنصر نہیں تھا، بلکہ بعض روایات کے مطابق تو تاکید و تعہد کا عنصر بھی نہیں تھا اور وہ کیسے ہو سکتا تھا؟ کیوں کہ رمضان کے روزوں کی فرضیت نے روزہ عاشوراء کی فرضیت لے لی تھی اور اب روزہ عاشوراء کے بارے میں حکم و امر نبوی صرف سنت کو موکد کرنے کی خاطر تھا، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام - اکابر صحابہ کرام کا رویہ یکسر بدل گیا تھا، ان میں سے بہت سے حضرات و خواتین روزہ عاشوراء رکھا ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے استحباب کو ثابت کرنے کی خاطر اس خاص دن خاص طور سے افطار کیا کرتے تھے، تاکہ رمضان کے صیام کی فرضیت کی اہمیت اور اس کے بعد روزہ عاشوراء کا استحباب ان کے طرز عمل سے اجاگر ہو جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ اب روزہ عاشوراء فرض نہیں رہا جیسا کہ وہ فرضیت رمضان سے قبل تھا۔

یہودی روزۂ عاشوراء سے متعلق احادیث صیام یوم عاشوراء کے ابواب حدیث میں تمام متعلقہ احادیث بلا ترتیب پائی جاتی ہیں اور وہی الجھن کا سبب بنی ہیں، محدثین کرام نے اپنے فقہی اور دینی نظریات و اصول کے تحت ان روایات و احادیث کو اپنی اپنی کتابوں میں بیان فرما دیا، ان میں تاریخی اور توقیتی توقیت و ترتیب اکثر و بیشتر قایم نہیں کی جس نے بعد کے ہم کم علموں کو خاصی مشکلات سے دوچار کر دیا، لہذا اپنی کم علمی اور کم فہمی کے سبب ہم نے اس مقالے میں تاریخی ترتیب اور موضوعاتی نسبت سے احادیث کو نقل کیا ہے، ذیل میں اسی طریقہ بحث اور منہج پیش کش کے مطابق تمام احادیث کو پیش کیا جاتا ہے جو یہودی روزہ عاشوراء سے متعلق ہیں:

(الف) طبقۂ اول

۲۰۰۴- حدثنا ابو معمر حدثنا عبد الوارث عن ایوب عن عبد الله بن سعید بن جبیر عن ابیه عن ابن عباسؓ قال: قدم النبی ﷺ المدینة فرای الیهود تصوم عاشوراء، فقال: ما هذا؟ قالوا: هذا یوم صالح هذا یوم نجی الله

بنی اسرائیل من عدوهم فصامه موسی قال: فانا احق بموسی منکم فصامه وامر بصیامہ (اطرافه فی: ۳۳۹۷، ۳۹۴۳، ۴۶۸۰، ۴۷۳۷) بخاری، فتح الباری، ۳۱۰/۴-۳۱۶، ابن ماجه، سنن (عیسی البابی مصر قاہرہ، ۱۹۵۲ء)، باب صیام یوم عاشوراء، حدیث: ۱۷۳۴، ۵۵۲)

(۱۲۷)-(۱۱۳۰) حدثنا یحییٰ بن یحییٰ اخبرنا هشیم عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ قال: قدم رسول اللّٰه ﷺ المدینة فوجد الیهود یصومون یوم عاشوراء فسئلوا عن ذلک فقالوا: هذا الیوم الذی اظهره اللّٰه فیه موسیٰ و بنی اسرائیل علی فرعون فنحن نصومه تعظیما له فقال النبی ﷺ: "نحن اولیٰ بموسی منکم" فامر بصومه۔ (مسلم، نووی، ۲۰۲/۲، سنن ابی داؤد، حدیث: ۲۴۴۱، ۴۱۶-۴۱۷)

وحدثنا ابن بشار و ابو بکر بن نافع جمیعا عن محمد بن جعفر عن شعبة عن ابی بشر بهذا الاسناد و قال: فسألهم عن ذلک۔

(۱۲۸) وحدثنی ابن ابی عمر حدثنا سفیان عن ایوب عن عبداللّٰه بن سعید بن جبیر عن ابیه عن ابن عباسؓ: ان رسول اللّٰه ﷺ قدم المدینة فوجد الیهود صیاما یوم عاشوراء فقال لهم رسول اللّٰه ﷺ: ما هذا الیوم الذی تصومونه؟ فقالوا: هذا یوم عظیم انجی اللّٰه فیه موسیٰ و قومه و غرق فرعون و قومه فصامه موسی شکرا فنحن نصومه فقال رسول اللّٰه ﷺ: فنحن احق و اولی بموسی منکم فصامه رسول اللّٰه ﷺ و امر بصیامه۔ (مسلم، نووی، ۲۰۲/۲-۲۰۳)

(۲۲۷) عن ابی هریرةؓ قال: مرّ النبی ﷺ باناس من الیهود قد صاموا یوم عاشوراء، فقال: ما هذا من الصوم؟ قالوا: هذا الیوم الذی نجی اللّٰه موسی وبنی اسرائیل من الغرق و غرق فیه فرعون وهذا یوم استوت فیه السفینة علی الجودی فصامه نوح و موسی شکر اللّٰه تعالی فقال النبی ﷺ: انا احق

بموسی و احق بصوم هذا الیوم فامر اصحابه بالصوم۔

(۲۲۸) عن ابن عباسؓ قال: قدم رسول اللّٰه ﷺ المدینة فرای الیهود یصومون یوم عاشوراء فقال: ما هذا الیوم الذی تصومون؟ قالوا: هذا یوم صالح هذا یوم نجی اللّٰه بنی اسرائیل من عدوهم قال: فصامه موسی قال قال رسول اللّٰه ﷺ وعلی آله وصحبه وسلم: انا احق بموسی منکم قال: فصامه رسول اللّٰه ﷺ وامر بصومه۔ (مسند احمد، ساعاتی، ۱۷۷/۱۰-۱۷۸)

(ب) طبقۂ دوم

۲۰۰۵: حدثنا علی بن عبداللّٰه حدثنا ابو اسامة عن ابی عمیس عن قیس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن ابی موسیؓ قال: کان یوم عاشوراء تعده الیهود عیدا قال النبی ﷺ: فصوموه انتم۔ (طرفه فی: ۳۹۴۲، بخاری، فتح الباری، ۳۱۰/۴-۳۱۶)

(۱۲۹)-(۱۱۳۱) وحدثنا ابو بکر بن ابی شیبة وابن نمیر قالا: حدثنا ابو اسامة عن ابی عمیس عن قیس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن ابی موسی قال: کان یوم عاشوراء یوما تعظمه الیهود و تتخذه عیدا فقال رسول اللّٰه ﷺ: صوموه انتم۔

(۱۳۰) وحدثنا احمد بن المنذر حدثنا حماد بن اسامة حدثنا ابو العمیس اخبرنی قیس فذکر بهذا الاسناد مثله وزاد قال ابو اسامه: فحدثنی صدقة بن ابی عمران عن قیس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن ابی موسیؓ قال: کان اهل خیبر یصومون یوم عاشوراء یتخذونه عیدا ویلبسون نساء هم فیه حلیهم وشارتهم فقال رسول اللّٰه ﷺ: فصوموه انتم۔ (مسلم، نووی، ۲۰۲/۲-۲۰۳)

(ج) طبقۂ سوم

(۲۳۰) عن جابر بن عبداللّٰہؓ انه قال: امرنا رسول اللّٰه ﷺ بیوم

عاشوراء ان نصومه وقال هو يوم كانت اليهود تصومه ۔ (مسند احمد، ساعاتی، ۱۷۹/۱۰)

یہودی سنت سے متعلق صیام عاشوراء کی متنی تحقیق

ہماری بیشتر کتب حدیث میں جو متداول ہیں یہودی سنت سے متعلق روایات واحادیث کی اکثریت صرف چند کتب حدیث میں ہیں، ان میں صحیحین کے علاوہ مسند احمد سب سے زیادہ نمایاں بلکہ سرفہرست ہیں، بعض دوسری کتب میں بھی وہ ملتی ہیں لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع میں وہ موجود نہیں ہیں، ان کی وجوہ سے بحث بھی تحقیق طلب ہے اور سرفہرست ہے اور یہ بھی توجہ طلب ہے کہ امام مالک نے ان کو کیوں شامل کتاب نہیں کیا، یہی بات امام ترمذی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، سندی اعتبار سے ان احادیث کریمہ کے مختلف طبقات ملتے ہیں: ایک طبقہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی روایات ہیں جو ان سے ان کے شاگرد رشید اور تابعی جلیل حضرت سعید بن جبیرؒ نے نقل کی ہیں اور ان سے دوسرے متاخر رواۃ نے صحیحین اور مسند احمد کی روایات کا یہ طبقہ ان ہی سے مروی ہے۔

دوسرے طبقہ میں حضرات ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی روایات صحیحین میں ہیں اور صحابی جلیل سے نقل کرنے والے حضرت طارق بن شہابؓ ہیں۔

چوتھے طبقہ میں مسند احمد کی حدیث حضرت ابی ہریرہؓ دوسی ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے بالکل مماثل ہے۔

پانچویں طبقہ میں مسند ہی کی ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ خزرجی انصاری کی واحد روایت رکھی جاسکتی ہے اور اس میں یہود کے روزے کا حوالہ ہے۔

زمانی توقیت، تاریخی ترتیب اور سندی حیثیت سے حضرات ابن عباسؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث وروایات کا شمار مراسیل صحابہ میں کرنا چاہیے کیوں کہ وہ ہجرت نبویؐ کے کافی عرصے بعد مدینہ پہنچے تھے، لہذا انہوں نے یہ تمام روایات واحادیث دوسرے معاصر صحابہ کرام یا مشاہدہ یعنی راوی صحابہ سے اخذ کی تھیں اور ان کا حوالہ موجود نہیں، بلاشبہ محدثین کرام کے ایک عظیم طبقہ کے نزدیک مراسیل صحابہ معتبر، ثقہ اور حجت ہیں اور ان کی ثقاہت سے بہرحال مجال انکار نہیں تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ ان احادیث کے صحابی راوی اس

وقت موجود نہ تھے اور انہوں نے دوسروں سے اخذ کیا ہے، وہ بہرحال مراسیل ہیں۔

متنی تحقیق کا معاملہ اور بھی اہم ہے، ان کے متن، موضوع اور مفہوم اور ان کا اطلاق کے لحاظ سے اسے کرنا چاہیے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت مسند سے مروی احادیث میں یہودی سنت اور موسوی روایت کا واضح ذکر پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھ کر یہود مدینہ سے اس کا سبب معلوم کیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ کے فرعونی مظالم سے نجات پانے، حضرت موسیٰ کے بہ طور شکرانہ روزہ عاشوراء رکھنے کی بات کی، اس بنا پر رسول اکرمؐ نے حضرت موسیٰ سے اپنی خاص نسبت کا اظہار فرمایا اور خود بھی روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا، حضرت ابوہریرہ دوسیؓ کی مماثل حدیث کی سند اگرچہ مختلف ہے مگر متن یکساں ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کو غریب کہا گیا ہے مگر اس میں ایک متنی اضافہ بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ حضرت نوحؑ کا سفینہ بھی اسی دن جودی پہاڑ پر رکا تھا اور انہوں نے بھی بہ طور شکر روزہ رکھا تھا، حافظ ابن حجر کا یہ خیال کہ حضرت نوحؑ کا ذکر محض مشارکت کے سبب ہے صحیح نہیں ہے (۳۱۵/۴) کیوں کہ روزہ عاشوراء محض یہودی و موسوی روایت نہیں تھی۔

بہ اعتبار متن دوسرے طبقہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی روایات ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ یوم عاشوراء یہودیوں کا عید کا دن تھا جس کی وہ تعظیم کرتے تھے اور آرائش وزیبائش کے علاوہ روزہ بھی رکھا کرتے تھے، رسول اکرمؐ نے ان کا روزہ عاشوراء لے لیا اور اس کو رکھنے کا حکم مسلمانوں کو دیا، ان میں آپؐ کے روزہ رکھنے یا حضرت موسیٰ کے شکرانے وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت مسند میں رسول اکرمؐ کے حکم روزۂ عاشوراء کا ذکر ہے اور یہودیوں کے بھی روزہ رکھنے کا ذکر ہے مگر یہودی سنت یا موسوی شریعت کا علاقہ وربط اسلامی حکم نبوی سے نہیں جوڑا گیا ہے بلکہ ان دونوں کو دو آزاد واقعات کے بہ طور بیان کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کو بھی یوم عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم نبوی عطا ہوا اور اس دن اتفاق سے یہود بھی رکھتے تھے، لہذا حضرت جابرؓ کی روایت کا متن اسے اسلامی فریضہ سے متعلق احادیث سے مربوط کرتا ہے اور یہود کا حوالہ محض ایک معاصر واقعاتی حوالہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث وروایت میں حضرت نوحؑ کے روزۂ شکرانہ کے ذکر نے اسے خالص یہودی روایت اور موسوی سنت نہیں رہنے دیا ہے بلکہ اسے اسلام کے اولین مظاہر اور سابقہ

شریعتوں کا ایک مسلسل فریضہ بنا دیا ہے جو نبی بعد نبی منتقل ہوتا ہوا حضرت موسیٰ تک پہنچی تھا اگر یہ سب یہودی صحیح ہے تو اتفاق سے اس دن یہودی یوم نجات پر پڑ گیا تھا، جس طرح اس مبارک دن اور یوم سعید پر حضرت آدم کے وقت سے متعدد اہم واقعات ہوتے رہے تھے، لہٰذا وہ اسلامی حکم بنا۔ (اوجز المسالک، ۴۸/۳ میں مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے ان تاریخی واقعات عاشوراء کو مختلف قدیم اہل علم سے نقل کیا ہے)

یہودی سنت روزہ سے متعلق احادیث وروایات کے متون کے علاوہ بعض توجیہات شارحین حدیث نے پیش کی ہیں، ان میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، امام نوویؒ کے علاوہ دوسرے قدیم وجدید بہت سے اہل علم، فکر اور صاحبانِ نظر شامل ہیں، ان کی بعض توجیہات خاص ہیں اور بعض عام ومشہور، ان میں سے سب سے مشہور توجیہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد رسول اکرمؐ نے روزۂ عاشوراء کا حکم اس لیے دیا کہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں آپؐ اہل کتاب سے موافقت پسند فرماتے تھے بشرطیکہ وہ ان امور میں ہو جن میں آپؐ کے پاس وحی الٰہی یا دوسرے ذریعہ سے کوئی حکم الٰہی ثابت نہ ہو، روزۂ عاشوراء انہیں میں سے تھا لہٰذا آپؐ نے وحی کی غیر موجودگی میں اپنی موافقتِ اہل کتاب کے معمول کے سبب اس کو اسلام میں قبول فرمایا، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس توجیہ کو یوں نقل فرمایا ہے:

”......وقد کان یحب موافقة اهل الکتاب فیما لم یومر فیه بشئی ولا سیما اذا کان فیما یخالف فیه اهل الاوثان ...فهذا من ذلک فوافقهم اولا وقال: نحن احق بموسی منکم ۔ “۔(فتح الباری، ۳۱۱/۴)

دوسرے شارحین حدیث نے بھی اسی موافقت اہل کتاب کی توجیہ وتشریح پیش کی ہے جیسے ساعاتی (۱۸۹/۱۰)، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ (۴۹/۳)۔

مگر اس ضمن میں موافقت اہل کتاب کا نظریہ صحیح ثابت نہیں ہوتا جس پر اس کے قائل شارحین کی نظر نہیں گئی ہے، البتہ بعض اہل فکر ونظر نے واضح کیا ہے کہ رسول اکرمؐ مکی دور سے روزۂ عاشوراء رکھتے چلے آرہے تھے اور وہ ملت حنفی کی پیروی میں بھی تھا اور ایک اسلامی حکم بھی، اولین دور مدینہ میں یہ جو یہودی تھا لہٰذا مدنی دور میں بھی وہ اتفاقی واقعہ تھا اور وہ دراصل مماثلت شریعت اسلامی تھی، امام نووی نے امام مازری کے قول مختار کا اور اس کا اختصار پیش کیا ہے کہ مدینہ میں بھی آپؐ نے

اس کو اسی طرح رکھا جس طرح آپؐ قریش مکی مانند پہلے سے رکھتے آرہے تھے، مدینہ آکر آپؐ نے یہود کو روزۂ عاشوراء رکھتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے بھی رکھا لیکن اس وحی کے سبب، تواتر کے عمل میں یا اجتہاد سے رکھا نہ کہ صرف یہودی روایت خبر بیان کی بنیاد پر تھا، متن نووی ہے:

” قلت: المختار قول المازری ومختصر ذلک انه ﷺ کان یصومه کما تصومه قریش فی مکة ثم قدم المدینة فوجد الیهود یصومونه فصامه ایضا بوحی اوتواترا او اجتهاد لا بمجرد اخبار احادهم ......“۔ (المنهاج ۲۰۴/۲)

مخالفتِ یہود سے متعلق احادیث نبویؐ

صیام عاشوراء سے متعلق احادیث نبویؐ کا ایک طبقہ جہاں یہ ثابت کرتا ہے کہ موسوی سنت کی پیروی میں مسلمانوں کو روزۂ عاشوراء رکھنے کا حکم رسول اکرمؐ نے دیا اور پوری تاکید شرعی اور تسلسل حکمی کے ساتھ دیا، وہاں دوسرا طبقہ یہ بتاتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان کی عمومی مخالفت کے علاوہ یوم عاشوراء کے سلسلے میں بھی اختلاف کا حکم دیا، ان روایات و احادیث کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ عاشوراء سے ایک دن پہلے نویں محرم یا ایک دن بعد گیارہویں محرم کو بھی روزہ رکھیں اور آپؐ نے اپنے ارادہ صادق اور عزم راسخ کا بھی اظہار فرمایا کہ اگلے سال بشرط حیات آپؐ نویں کا بھی روزہ رکھیں گے، پہلے ان تمام احادیث وروایات کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ بعد میں ان پر مختلف جہات سے بحث کی جاسکے، اس باب میں بھی دو طبقات حدیث ہیں: اول آپؐ کے ارادے سے متعلق اور دوم آپؐ کے مخالفت یہود کے حکم سے وابستہ لہٰذا پہلے ارادہ نبویؐ کی احادیث:

ارادہ نبویؐ سے متعلق احادیث

(۱۳۳)(۱۱۳۴) وحدثنا الحسن بن علی الحلوانی حدثنا ابن ابی مریم حدثنا یحیی بن ایوب حدثنی اسماعیل بن امیه انه سمع ابا غطفان بن طریف المری یقول: سمعت عبد الله بن عباس یقول: حین صام رسول الله ﷺ یوم عاشوراء وامر بصیامه قالوا: یا رسول الله ﷺ انه یوم تعظمه الیهود والنصاری فقال رسول الله ﷺ فاذا کان العام المقبل ان شاء الله صمنا الیوم التاسع قال: فلم یات العام المقبل حتی توفی رسول الله ﷺ۔ (مسلم،

نووی، ۲۰۵/۲، ابوداؤد، سنن، باب ما روی ان عاشورا، الیوم التاسع حدیث ۲۴۴۲، ۲۱۷)

(۱۳۴) وحدثنا ابو بکر بن ابی شیبة وابو کریب قالا: حدثنا وکیع عن ابن ابی ذئب عن القاسم بن عباس عن عبد اللہ بن عمیر "لعله قال عن عبد اللہ بن عباسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ لئن بقیت الی قابل لاصومن التاسع وفی روایة ابی بکر قال: یعنی یوم عاشوراء ۔ (مسلم، نووی، ۲۰۵/۲، نیز ابن ماجه، سنن، باب صیام یوم عاشوراء، حدیث: ۱۷۳۶، ۵۵۲-۵۵۳: وزاد فیه: مخافة ان یفوته عاشوراء)

(۲۴۸) وعنه ایضا (ای عن ابن عباسؓ) قال: قال رسول اللہ ﷺ: لئن بقیت الی قابل لاصومن الیوم التاسع ۔ (مسند احمد، ساعاتی، ۱۸۹/۱۰)

علما کی بحث و شرح مخالفت یہود و نصاریٰ کی روایت و احادیث کی زمانی توقیت اور درایتی تحلیل نہ کرنے کے سبب کئی غلط فہمیاں درآئیں، اول یہ سرے سے ذہنوں سے نکل گیا کہ عاشوراء کا روزہ دراصل شریعت ابراہیمی اور دین حنیفی کا حکم ہے اور صدیوں سے چلا آرہا تھا، دوم سب سے زیادہ حیرت انگیز و قابل افسوس معاملہ یہ ہوا کہ رسول اکرمؐ کے پورے مکی دور کے معمول نبوی اور اسلامی فریضہ کو بھلا دیا گیا، سوم نتیجہ لازمی طور سے یہ نکلا کہ عاشوراء کے مکی اسلامی فریضہ اور دین ابراہیمی کے حکم کا تعلق و ربط یہودی روایت سے بالکل نہیں جوڑا گیا، چہارم یہ کہ یہودی روزۂ عاشوراء کو اصل مان کر اسلامی نظام عبادات میں واحد سنت نبوی بنا دیا گیا جس نے اور بھی غلط فہمیاں جنم دیں۔

اگر تمام احادیث کا مجموعی درایتی تجزیہ کیا جاتا تو ان غلط فہمیوں اور کج نظریوں کا سد باب بآسانی کیا جا سکتا تھا، رسول اکرمؐ کے مدینہ آنے کے بعد یہودی روزۂ عاشوراء کے مشاہدہ و علم نبوی کو ہجرت کے معاً بعد کا واقعہ قرار دینے کا نتیجہ برا نکلا، اسی طرح رسول اکرمؐ کے اسلامی مکی روزۂ عاشوراء کے اولین سنہ مدنی میں رکھنے کو یہودی روایت روزہ کا پرتو سمجھا لیا گیا حالاں کہ صورت حال بالکل مختلف تھی کہ رسول اکرمؐ نے اپنا اسلامی روزۂ عاشوراء رکھا اور اسی کو رکھنے کا حکم مدنی طبقات کو دیا، اتفاق سے اسی دن کا روزہ یہودی بھی رکھتے تھے، اس روایت موسوی کا معاملہ رسول اکرمؐ کے علم میں آیا مگر اسی دوران رمضان المبارک کے روزے فرض ہوگئے اور روزۂ عاشوراء کی فرضیت

منسوخ ہوگئی، بعد میں رسول اکرمؐ نے یہودی روزہ کی تحقیق کی اور فرضیت رمضان کے بعد حضرت موسیٰ کی روایت و سنت میں عاشوراء کا روزہ رکھ کر مسلمانوں کو مستحب روزہ پر آمادہ کیا۔

رسول اکرمؐ کے حیات دنیاوی کے آخری برس بلکہ محرم ۱۱ھ کے روز عاشوراء کا روزہ رکھا گیا تو آپ کی مزید توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی۔ یہودی اس دن کی خاص عزت و حرمت کرتے ہیں اور اور اسے قومی عید کہتے ہیں، لہذا یہودی تیوہار سے اسلامی مسنون روزۂ عاشوراء کو ممتاز کرنے اور عام اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لیے آپ نے اگلے سال بہ شرط حیات نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھنے کا عزم ظاہر کیا جو تقدیر الٰہی سے پورا نہیں ہوا کہ اسی سال ربیع الاول میں وفات ہوگئی، ۹ محرم کے روزے کو عاشوراء کے روزے سے ملا کر دو دن رکھنے کا عزم نبویؐ اور اس سے متعلق احادیث کو دراصل اس پس منظر میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

خوش قسمتی سے ہمارے قدیم و جدید شارحین حدیث میں سے متعدد اکابر نے رسول اکرمؐ کے نو محرم کو روزہ رکھنے کے عزم سے متعلق احادیث و روایات کا اس صحیح تاریخی پس منظر میں مطالعہ و تجزیہ کیا ہے جو بعض نظروں سے اوجھل رہا، امام نوویؒ کی بحث زیادہ تر حضرت ابن عباسؓ سے مروی یا ان کی طرف منسوب ایک روایت پر مرکوز رہی ہے اور بعض دوسرے شارحین نے بھی یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا خیال یہ بتایا گیا ہے کہ عاشوراء سے مراد دراصل نویں تاریخ ہے جو عربوں کی ایک روایت پر مبنی ہے، جمہور سلف و خلف علما کے مسلک و اتفاق سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عاشوراء سے محرم کی دسویں تاریخ مراد ہے نہ کہ نویں اور یہی تمام دوسری احادیث نبوی کے متون سے ثابت ہوتا ہے، اسی ضمن میں امام موصوف نے یہ لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور اگلے سال نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھنے کا ارادہ کیا، لہذا امام شافعیؒ، ان کے اصحاب، امام احمدؒ و امام اسحاقؒ اور دوسرے علما کے نزدیک نویں دسویں دونوں کا روزہ رکھنا مستحب ہے اور نویں کا روزہ رکھنے کا دسویں کے ساتھ جمع کرنے کا سبب یہ تھا کہ صرف دسویں میں جو یہود سے تشبہ ہو جاتا ہے اس سے بچا جا سکے۔

"وقال العلماء: ولعل السبب فی صوم التاسع مع العاشر ان لا یتشبه بالیهود فی افراد العاشر وفی الحدیث اشارة الی هذا وقیل: للاحتیاط فی تحصیل عاشوراء والاول اولی"۔ (نووی، ۲۰۵/۲)

امام بخاری نے اگرچہ نویں تاریخ سے متعلق حدیث نبوی نقل نہیں کی ہے تاہم دوسرے علما و شارحین کی طرح حافظ ابن حجرؒ نے بھی حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث کہ عاشوراء سے مراد نویں تاریخ پر بحث کی ہے اور علما کی آرا و تشریحات پیش کرکے اس خیال کی تردید کی ہے، اسی ضمن میں امام نوویؒ کی طرح رسول اکرمؐ کے نویں کے روزے کو عاشوراء کے روزے سے ملانے والی روایات کا تجزیہ کیا ہے اور وہی نتیجہ نکالا ہے جو امام نوویؒ کے ہاں ملتا ہے، البتہ ان کی بحث کافی مدلل و مفصل ہوگئی ہے۔

اس حدیث زیر بحث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ عاشوراء یعنی دسویں تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے اور جب آپؐ نے نویں کے روزہ کو اس سے ملانے کی نیت کی تو اسی حدیث کے متن سے ثابت ہوا کہ صرف نو کے روزہ پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ نویں کے روزے کو دسویں کے روزے پر اضافہ کرنے کا ارادہ و نیت رکھتے تھے، غالباً احتیاط کی خاطر یا یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے لیے جو زیادہ راجح ہے اور امام مسلمؒ کی بعض روایات سے اسی کا ادراک و شعور بھی ہوتا ہے جیسا کہ مخالفت کی احادیث میں بھی ہے:

"...... فلنه ظاهر فی انه ﷺ کان یصوم العاشر وهم بصوم التاسع فمات قبل ذلک ثم ما تقدمه من صوم التاسع یحتمل معناه انه لا یقتصر علیه بل یضیفه الی الیوم العاشر اما احتیاطا له واما مخالفة للیهود والنصاری وهو الارجح وبه یشعر بعض روایات مسلم" (فتح الباری ۴/۳۱۱، نیز ملاحظہ ہو ان اقوال کی نقل و شرح کے لیے علامہ بنوری، معارف السنن، ۵/۴۳۳-۴۳۴، شیخ محمد زکریا کاندھلوی، اوجز المسالک ۳/۴۹-۵۰)

حافظ موصوف نے اس کے بعد واضح احکام الٰہی کی عدم موجودگی میں اہل کتاب کی موافقت کے نظریہ سے بحث کی ہے کہ شروع میں صرف دسویں (عاشوراء) کا روزہ آپؐ نے اسی موافقت کی سنت کے مطابق رکھا تھا " وقد کان ﷺ یحب موافقة اهل الکتاب فیما لم یؤمر فیه بشئ ولاسیما اذا کان فیما یخالف فیه اهل الاوثان " (فتح الباری ۴/۳۱۱) حافظ موصوف نے صرف اولین مدنی دور میں موافقت کی بات نہیں کہی بلکہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے مدمقابل مشرکوں کے مغلوب ہونے کے بعد بھی ان کی مخالفت نبوی کا نظریہ پیش کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہی ہے کہ شروع میں عاشوراء کا روزہ اہل کتاب کی موافقت میں رکھا تھا۔

ان کا یہ نظریہ موافقت و مخالفت اہل کتاب کم از کم روزہ عاشوراء کے معاملے میں صحیح ثابت نہیں ہوتا ہے، اول دلیل اور حدیث یہ ہے کہ رسول اکرمؐ جب مکہ میں تھے اور اس معاملہ میں نہ اہل اوثان کی مخالفت کرتے تھے اور نہ اہل کتاب کی موافقت و مخالفت، رسول اکرمؐ نے اچھی چیز کو قبول کیا اور دینی معاملات میں صحیح احکام تعظیمی کی پیروی کی خواہ اہل اوثان اس کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں، آپؐ نے مکی دور میں روزہ عاشوراء رکھا، بعثت سے قبل بھی اور بعثت کے بعد بھی اور مسلمانوں سے بھی بعثت کے بعد رکھوایا، قریش اور دوسرے "اہل اوثان عرب" بھی اس زمانے میں روزہ عاشوراء رکھا کرتے تھے، آپؐ نے ان کی اس معاملہ میں مخالفت نہیں کی کیونکہ صرف روش اہل کفر کی مخالفت کرنا مقصود نبوی تھا ہی نہیں، مخالفت و اختلاف تو صرف نامعقول اور مشرکانہ کاموں میں فرماتے تھے، افعال خیر خواہ ان کا حکم ہو یا نہ ہو قبول فرماتے ہی نہیں تھے بلکہ ان پر عمل کرتے تھے اور مسلمانوں کو ان کا حکم بعد نبوت دیتے تھے، موافقت اہل کتاب کے خیال سے اول دور میں رسول اکرمؐ نے روزہ عاشوراء نہیں رکھا تھا بلکہ مکی دور سے اسے اسلامی روزہ کے بطور رکھتے آرہے تھے اور پھر پورے مدنی دور میں آپؐ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور وہ فتح مکہ کے بعد ہی نہیں بلکہ حیات دنیوی کے آخری برس تک رکھا، حیرت کی بات ہے کہ آگے بحث میں حافظ موصوف نے یہی لکھا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ کسی حال میں بھی آپؐ نے ان کی اقتدا میں روزہ عاشوراء نہیں رکھا، (۴/۳۱۲) لیکن پھر موافقت اہل کتاب کا نظریہ یہاں بھی پیش کر دیا: " وعلی کل حال فلم یصمه اقتداء بهم فانه کان یصومونه قبل ذلک وکان ذلک فی الوقت الذی یحب فیه موافقة اهل الکتاب فیما لم ینه عنه " پورے دس سال تک رسول اکرمؐ کا روزہ عاشوراء موافقت اہل کتاب میں نہیں رکھا گیا تھا اور حیات طیبہ کے اواخر میں آپؐ نے جس ارادہ کا اظہار فرمایا تھا، وہ یہودی عید سے تشبہ کا معاملہ تھا، محض ان کے روزہ عاشوراء سے مخالفت کا معاملہ نہ تھا، غلط فہمی یہاں یہ ہوگئی کہ آپؐ کے ارادے و نیت کے پس پشت پنہاں وجہ و سبب کو نہیں سمجھا گیا اور سب نے یہی لکھا، مزید بحث مخالفت یہود یا مخالفت اہل کتاب کے حکم نبوی پر مبنی احادیث کے ضمن میں آگے آتی ہے۔

(باقی)

ظہیر الدین محمد بابر

ایک اولوالعزم فاتح اور مدبر حکمراں

از:- جناب محمد شمیم اختر قاسمی صاحب☆

(۲)

بلوچ کی بغاوت اور سلطان محمود کا بہار پر قبضہ بابر کو جب ذرا سکون میسر آتا تو وہ تفریح کے لیے دار الخلافت سے باہر چلا جاتا اور قدرتی مناظر اور باغ باغیچوں سے لطف اندوز ہوتا، مالوہ کی جنگ کے بعد اس نے گوالیر کا رخ کیا، سیر و تفریح کے علاوہ مقدس مقامات کی بھی زیارت کی، یہیں سے وہ بڑے شوق سے سرخ گلاب کا پودا اپنے ساتھ آگرہ میں لگانے کے لیے اس لیے لایا کہ یہاں یہ دست یاب نہ ہوتا تھا، مگر دار الحکومت پہنچتے ہی اطلاع ملی کہ بلوچ متحد ہو کر سرکشی و بغاوت پر آمادہ ہیں، دوسری طرف سکندر لودھی کے بیٹے سلطان محمود نے بہار پر قبضہ جما لیا ہے اور اپنی حکومت کو وسعت دینے کے لیے لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے والا ہے اور اس کی فوج قنوج میں اکٹھا ہوگئی ہے مگر بابر نے ملتان کے بجائے پہلے سلطان کی خبر لینا ضروری سمجھا اور اپنے لشکروں کو تیزی سے پیش قدمی کرنے کا حکم دیا، اس جنگ کی قیادت محمود لودھی خود کر رہا تھا اور اس کی مدد کے لیے نصرت شاہ بنگال بھی پہنچ گیا، ۶ مئی ۱۵۲۹ء کو یہ جنگ گاگرا (گھاگرا) کے کنارے پٹنہ کے قریب ہوئی، افغانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، جب کہ نصرت شاہ والی بنگال نے بابر سے چند شرائط کے ساتھ صلح کر لی، اس طرح بہار بھی بابر کے تخت کا ایک حصہ بن گیا۔

بابر کا عدل اور رعایا پروری بابر عادل اور انصاف پرور شخص تھا، لوگوں کے درمیان اس نے عدل

☆ ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات، اے-ایم-یو، علی گڑھ۔

قایم کیا، بہت رحم دل اور مہربان بھی تھا، اس نے آگرہ میں ابراہیم کی والدہ کی خدمت میں سات لاکھ روپیہ پیش کیا، مگر یہ بد بخت عورت نے بابر کے ساتھ غداری کی اور اس کے کھانے میں زہر ملوا دیا، اکبری دربار کا ایک شاعر بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں کی مدح میں یوں رطب اللسان ہے:

"بابر، ہمایوں غازی صفت ہیں قول و فعل اور فکر میں اٹل ہیں، اتنے طاقت ور ہیں کہ جسے چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں جسے چاہتے ہیں توڑتے ہیں جن کو دیکھ کر دشمن ششدر رہ جاتے ہیں، باکمال بے کمال ہندو ترک بھی اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں"[۱]

ایک اور شاعر کہتا ہے:

"شہنشاہ بابر جیسی حکومت کسی اور کی نہیں تھی، اسے گویا سلیمان کی مملکت مل گئی اور عمرؓ کا عدل، علیؓ کی تلوار سے حاصل ہے اور جس نے خشکی اور تری زیر کر لیا حمزہؓ جیسی طاقت اسے مل گئی اور جو اس کے سامنے آئے مارا جائے"[۲]

اس میں شبہہ نہیں کہ بادشاہ نے انصاف کو اپنے ہاتھ سے کھونے نہیں دیا، اس نے رحم کی وہ مثال قایم کی جس کی نظیر کم ہی مل سکتی ہے، اس نے اپنے دشمنوں کو معاف کیا اور حکومت میں شامل کر کے اعزاز و اکرام سے نوازا، اس نے فیاضی کرنے میں اپنے دفینے خالی کر دیتا تھا، دوست و دشمن، اپنے پرائے کسی کو محروم نہ کرتا، جب وہ کسی جنگ میں کامیابی حاصل کرتا تو پہلے شکرانہ نماز ادا کرتا، اس کے بعد اپنے لواحقین کو ہدایا و تحائف سے نوازتا، فرشتہ اس کی فیاضی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"انتیس رجب کو بابر نے شاہان ہند کے دفینوں کا معاینہ کیا، بادشاہ نے ساڑھے تین لاکھ روپیہ نقد اور ایک سربمہر خزانہ ہمایوں کو عنایت کیا، محمد سلطان مرزا کو ایک کمر بند اور مرصع شمشیر اور ایک لاکھ روپے نقد دیے، اسی طرح دوسرے امیروں اور مرزاؤں اور لشکروں بلکہ طالب علموں اور سوداگروں کو انعام و اکرام سے نوازا، اس کے علاوہ بابر نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جو سمرقند و خراسان، کاشغر اور عراق میں تحفے اور ہدیے روانہ کیے، مکہ معظمہ و مدینہ منورہ، کربلائے معلی، نجف اشرف، مشہد مقدس اور دوسری متبرک جگہوں اور مزاروں پر نذریں چڑھائیں، فقرا اور حاجت مندوں کے

لیے روپے تقسیم کرنے کے لیے بھیجے، کابل کے تمام باشندوں کو شاہی انعام سے نوازا، ہر شخص کے لیے ایک شاہ رخی جس کا وزن ایک مثقال چاندی کے برابر تھا کس کے حساب سے روانہ کیا، المختصر پرانے بادشاہوں کی جمع شدہ دولت اس فقیر منش بادشاہ نے ایک ہی محفل میں لٹادی اور اپنی بے نیازی کا سکہ دلوں پر بٹھادیا"۔؎

فرشتہ نے بابر کے عدل و انصاف کا ایک بڑا اہم واقعہ یہ بیان کیا ہے:

"بابر کی منصف مزاجی بھی اعلا درجے کی تھی، اس کے انصاف کا یہ حال تھا کہ ایک بار شہر اندرجان میں ملک خطا کا ایک قافلہ آیا، اس قافلے پر بجلی گری اور سوائے دو افراد کے تمام اہل قافلہ لقمہ اجل ہوگئے، بابر کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے خدمت گاروں کو اس قافلے کے تمام مال و اسباب کو جمع کرنے کا حکم دیا، اگرچہ اس وقت مال و اسباب کا کوئی وارث موجود نہ تھا لیکن بابر نے تمام سامان اپنے پاس بڑی احتیاط سے رکھا، آس پاس کے علاقوں میں اپنے آدمی بھیج کر مرحومین کے وارثوں کو بلوایا، یہ وارث کامل دو سال کے بعد بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے، بابر نے تمام سامان جو اس کے پاس محفوظ تھا ان کے حوالے کردیا"۔ (ص:۶۰۹)

خافی خاں کے خیال میں یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب اس کی سلطنت پوری طرح قائم اور مستحکم نہیں ہوئی تھی اور اس کے پاس روپے پیسے کی قلت تھی اور وہ شراب کا عادی تھا، باوجود اس کے وہ ایمان داری اور دیانت داری اور خدا ترسی کا مظاہرہ کیا۔ (منتخب التواریخ، ص۔۹۴)

اتحاد و یک جہتی کی کوشش بابر بیرونی تھا اور اسے ہندوستان میں لڑنا بھی پڑا تھا مگر اس نے رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کی بڑی کوشش بھی کی تاکہ اس کی حکومت ہر قسم کے ضعف و انحلال سے محفوظ رہے، یہی وجہ ہے کہ بہت کم مدت میں اتنی طویل و عریض اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا، اس نے مسلمانوں ہی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ بھی ہمدردی و رواداری کا مظاہرہ کیا، نہ تو کسی مندر کو ہاتھ لگایا اور نہ کسی کو قبول اسلام پر مجبور کیا، ہندوانہ مراسم ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، ہندوؤں سے خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا تھا، ان کو ان کے حال پر ہی رہنے دیتا تھا مگر ان کے ساتھ فیاضی و ہمدردی و سلوک میں کمی نہ کرتا، اپنے بیٹے ہمایوں کو جو وصیت نامہ تحریر کیا، وہ اس کا

بین ثبوت ہے جو یہ ہے:

"فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا، تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے کسی رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا، (۲) گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرو تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں، (۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے، (۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی، (۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو، کیوں کہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا، (۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے"۔؎

یہ وصیت نامہ بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے، اس کے متعلق تحقیق و تفتیش بھی کی جا چکی ہے کہ اصلی ہے یا نقلی، محقق اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جعلی نہیں ہے، اس وصیت کا گہرا مطالعہ بابر کی شخصیت کو نئے نقطۂ نظر سے جانچنے پر مجبور کرتا ہے،[5] اگر یہ وصیت اصل ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بابر نے مغل حکومت کی داغ بیل سیکولر اور انسانی اصولوں پر رکھی تھی اور اپنے آنے والے وارثوں کو ہدایت کے طور پر جہاں بانی اور تہذیب کا ایک نیا راستہ بھی دکھایا تھا تاکہ مغل حکومت ایک نئی اور مثالی حکومت بن سکے۔

مغل حکومت کو استحکام اور عروج بخشنے میں بابر کی اولاد نے بھی بابر کی وصیت پر عمل کیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے اس نے اس بات پر زور دیا کہ جس چیز سے برادران وطن کو تکلیف اور اذیت پہنچے اور اسلام کو نقصان نہ پہنچے، اس سے پرہیز کیا جائے لہٰذا اس نے گاؤ کشی سے منع کیا، ایک بار کا

واقعہ ہے کہ ہمایوں کابل سے لوٹ رہا تھا، خبر ملتے ہی کامران اہل و عیال کے ساتھ پنجاب بھاگ گیا تو سراج خاں نے ہمایوں سے کہا کہ قلعہ میں تشریف لے چلیے، ہمایوں قلعہ میں آیا اور دیوان خانہ میں متمکن ہوا، رات کا وقت تھا بھوک لگی ہوئی تھی، رقیہ بیگم کو حکم بھجوایا کہ کھانے کا بندوبست کریں، بیگم نے گائے کے گوشت کی یخنی اور کباب خدمت میں پیش کر دیا، جیسے ہی ایک لقمہ بادشاہ نے منہ میں رکھا پتہ چل گیا کہ کھانا گائے کے گوشت کا ہے، اس نے لقمہ منہ سے گرا دیا اور کہا کہ:

> "بدنصیب کامران، تیری تباہی کا باعث ہے کہ تو لذت طعام کے لیے گایوں کو ہلاک کرتا رہا ہے، فرزندانِ بابر کے لیے گائے کے گوشت سے پرہیز لازم ہے، ہم چاروں بھائیوں کو وہی کرنا چاہیے جو ہمارے والد بزرگوار کرتے رہے ہیں، جب بھیڑیں اور بکریاں مل سکتی ہیں تو اس جانور کو کیوں ضائع کرتے ہو"۔[۷]

علمی ذوق اور علما پروری بابر کو علما کی قدردانی اور علم نوازی دادا اور نانا دونوں طرف سے ورثے میں ملی تھی، تیمور خاندان ہمیشہ سے علم نوازی کے لیے مشہور تھا، خود تیمور ایک صاحب علم، علما، فضلا اور ماہر فنون کا قدردان تھا، مگر ان کے نانا بھی اس میدان میں بہت فایق تھے، عمر شیخ مرزا نے تاشقند کے مشہور چغتائی خان یونس کی لڑکی قتلق نگار خانم سے شادی کی تو اس کی ایک بڑی وجہ یونس خاں کی علم دوستی بھی تھی، یونس خاں کی دوسری لڑکی خوب نگار خانم سے محمد حسین گورگان دوغلت نے شادی کی، اس سے ایک لڑکا حیدر مرزا دوغلت پیدا ہوا جو آگے چل کر تاریخ رشیدی کا مصنف بنا، حیدر مرزا نے اپنے نانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "خان (یعنی یونس خاں) مولانا شرف الدین علی یزدی کے ساتھ بارہ سال رہے اور فضایل کا کسب کیا، ان کے ایسا خان ان سے پہلے اور بعد میں نہیں پیدا ہوا، جب مولانا کا انتقال ہو گیا تو خان یزد سے عراق، فارس اور آذربائجان کی طرف چلے گئے، شیراز میں فضلا کی مجلسوں میں شریک رہے، یہاں وہ استاذ یونس خاں کے نام سے مشہور رہے .... ان میں بہت سے فضایل تھے، قرآن کی کتابت خوب کرتے تھے، موزوں طبیعت رکھتے تھے، موسیقی اور مصوری میں بھی ماہر تھے"۔[۸]

خاندانی ذوق اور علم پروری کا اثر بابر پر بھی تھا، علما و فضلا اس کی داد و دہش سے خوب متمتع

ہوتے تھے، اخوند میر جو حبیب السیر کے مولف ہیں، مرزا ابراہیم قانونی اور مولانا شہاب الدین میمائی وغیرہ کو بہت سے قیمتی تحایف سے نوازا، میمائی کی وفات بابر کی وفات کے ۵ سال بعد ہوئی[۹] اور خواجہ شیخ نظام الدین اولیا کی درگاہ میں سپرد خاک کیے گئے، یہ تمام علما اپنے اپنے فن کے بے نظیر استاد تھے اور ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔

شیخ زین الدین خاں معقولات و منقولات میں اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے، واقعات بابری کا انہوں نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا[۹] اور مثنوی مبین کی شرح لکھی[۱۰] بابر انہیں بہت محبوب رکھتا تھا، انہوں نے آگرہ میں ایک عربی مدرسہ بھی قایم کیا، ان کی وفات اسی مدرسہ کی بنیاد ڈالنے کے دوران ہو گئی لہذا انہیں اسی مدرسہ کے احاطہ میں دفن کیا گیا[۱۱] بابر نے جب رانا سانگا پر فتح پائی تو انہوں نے مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا، اس فرمان کے لکھنے والے شیخ صاحب ہی تھے[۱۲] جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> "شاہانہ مغلیہ میں بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا، اس نے ترکی زبان میں اپنے لڑکے کامران کے لیے ایک مثنوی مبین لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسایل پر دو ہزار اشعار ہیں، یہ کتاب فقہ بابری کے نام سے بھی مشہور ہوئی، وہ خواجہ عبداللہ احراری کا مرید تھا اور علم معقول اور منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام سیف الدین احمد، علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدرداں اور معترف رہا"۔[۱۳]

بزرگان دین سے عقیدت بابر صوفیہ اور صلحا کا بڑا قدرداں اور درویشوں کا عقیدت مند تھا، ان کا ادب و احترام بجا لانے کو اپنی سلطنت کی کامیابی سمجھتا تھا اور ان کے حکم کی تعمیل کو موجب سعادت سمجھتا تھا، امور سلطنت میں بھی ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا، جب خواجہ عبیداللہ کا انتقال ہوا تو بابر پر اس کا گہرا اثر ہوا، اس وقت بابر نے ان کی شان میں جو شعر کہے ان سے اس کی خواجہ سے عقیدت کا پتا چلتا ہے:

در ہوائے نفس گر عمر ضایع کردہ ایم   پیش اہل اللہ ز افعال خود شرمندہ ایم
یک نظر با مخلصانِ خستہ دل فرما کہ یار   خواجگی را ماندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

حضرت عبدالقدوس گنگوہی جو کبار صوفیہ میں تھے بابر ان کی خدمت میں حاضری دیا

کرتا تھا، حالاں کہ لودھی سے اس کی جنگ میں وہ لودھی کی فوج میں شامل تھے جن کو گرفتار کر کے بابر کے فوجیوں نے قید کر دیا تھا، پھر کچھ دن بعد ان کی رہائی ہوئی، اس کے بعد حضرت شیخ نے بابر کو نظام اسلامی کے قیام، شریعت اسلامیہ کی ترویج، عدل و انصاف اور حکومت کے نظام کو خلافت راشدہ کے نظام کے سانچے میں ڈھالنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا کہ وہ شہروں کو شریعت محمدیہ کے جمال و عدل سے آراستہ کرے، زکات کے علاوہ جو بھی ٹیکس مقرر کیے جائیں وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں، ملک کے علما، ایمہ اور ضعفا کو عزت دے تاکہ وہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور اطمینان اور آرام سے زندگی بسر کر سکیں، حکومت کے عہدوں پر امین و متدین لوگوں کو متعین کرے اور وہ خود بھی اسلام کا پابند ہو اور نماز با جماعت ادا کرے تاکہ دین کمال کو پہنچے، انہوں نے اسی طرح کے خطوط بابر کے بعد ان کے بیٹے ہمایوں اور دوسرے مغل حکمراں کو بھی لکھے۔[14]

بابر نے شراب پینا ترک کر دیا یہاں تک کہ شراب کے جو ظروف سونے چاندی کے تھے اسے ضایع کر دیا جس کی مثال جنگ کنھوایاں کے وقت مل جاتی ہے۔

بابر جب سفر کے لیے نکلتا تو اس کے ہم راہ علما اور اہل دین کی بڑی تعداد ہوتی تھی، جن سے وہ اہم امور میں مشورہ لیتا اور دینی مسایل میں بھی استفسار کرتا تھا، دین سے بابر کا شغف بڑھا تو شراب پینا ہی ترک نہیں بلکہ شراب کے سونے چاندی کے ظروف بھی ضایع کر دیے۔

کتب خانہ اور زیر مطالعہ کتابوں کی فہرست

بابر کو بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا اور آخر تک قایم رہا، جو کتابیں اکثر اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اپنی تزک میں ان کے نام بھی لکھے ہیں جو یہ ہیں: قرآن مجید، سعدی کی گلستاں بوستاں، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی اور خسرو کے خمسے، شمس الدین علی یزدی کا ظفر نامہ اور ابو عمر منہاج الجوزی کی طبقات ناصری وغیرہ۔[15]

وہ اپنے خالی اوقات کو ضایع نہیں کرتا بلکہ کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا، اس نے عمدہ عمدہ کتابیں مطالعہ کی غرض سے جمع کر رکھی تھی اور ایک عمدہ کتب خانہ اس کے پاس موجود تھا، ۹۳۲ھ میں بابر نے قصبہ ملوٹ پر فتح پائی تو وہ غازی خاں کے قلعہ میں داخل ہوا، خزینوں اور دفینوں

کے علاوہ اسے سب سے قیمتی چیز جو دست یاب ہوئی وہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا، جس کی عمدہ عمدہ کتابیں اپنے لیے مخصوص کر لیں اور بقیہ کو اپنے بیٹے کی طرف منتقل کر دیں۔[16] صباح الدین عبد الرحمن مرحوم لکھتے ہیں:

"بابر سفر و حضر دونوں میں کتب خانہ ساتھ رکھتا تھا، ۹۳۰ھ میں بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو لاہور کے پاس غازی خاں سے تصادم ہوا، غازی خاں کو شکست ہوئی تو بابر اس کے قلعہ میں داخل ہوا، جہاں اس کو بے شمار دولت ملی لیکن بابر کے لیے سب سے قیمتی سرمایہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا، غازی خاں بڑا علم دوست تھا، جید عالم ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی اعلا ذوق رکھتا تھا، اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کر رکھی تھیں، بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کر لیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں اور کچھ شہزادہ کامران کے لیے کابل روانہ کیں"۔[17]

تعلیمی خدمت

بابر کی تعلیمی خدمات کی تفصیل نہیں ملتی مگر ایک جگہ وہ اپنی تزک میں لکھتا ہے:

"اگر چہ ہندوستان فطرت کی دل کشی و رعنائی سے معمور ہے لیکن اس کے باشندے دل کشی و رعنائی سے محروم ہیں اور ان کے تعلقات میں نہ تو دوستانہ ایثار و محبت ہے، نہ وفا کیشی و استواری، ان کو کوئی فطری کمال، کوئی فہم و فراست، کوئی حسن اخلاق، کوئی جذبہ فیض رسانی اور کوئی صحت احساس حاصل نہیں، صنعت و حرفت میں ان کے طریقوں کی طرح ان کے تصورات میں بھی فن کاری اور اصول و نظریے کا فقدان ہے، یہاں نہ حمام ہے، نہ موم بتیاں ہیں، نہ مشعلیں، نہ اسکول، یہاں تک کہ شمع دان بھی نہیں"۔

بابر نے اسکول کے فقدان کا جو ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم کے لیے وہ ضرور فکر مند رہا ہوگا اور اس نے ان کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہوگا، اس نے ہندوستان میں تعلیم کی کمی کا جو شکوہ کیا ہے وہ صحیح نہیں کیوں کہ دہلی سلطنت میں پورے ہندوستان میں اچھے اچھے تعلیمی ادارے قایم تھے، مسجدوں اور خانقاہوں سے بھی تعلیم و تعلم کا کام لیا جاتا تھا۔[18]

بابر کا ادبی ذوق

مغلیہ خاندان نے بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا کیے ہیں لیکن بابر کی ذات میں ایک خاص دل کشی اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندووں کے برعکس جن کا مشترکہ طبقہ فنون جنگ

میں اور برہمن عمر وادب میں کمال حاصل کرتے تھے، اس خیال کا حامی تھا کہ ایک شخص بہ یک وقت صاحب سیف وقلم دونوں ہوسکتا ہے، چنانچہ وہ فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ فارسی و ترکی کا اچھا شاعر تھا، اور فرشتہ کے بیان کے مطابق علم موسیقی، شعر اور انشاء میں وہ بے نظیر تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری میں علی شیر نوائی سے کم رتبہ اور تمام شعرائے ترکی سے بلند تر تھا[19] اس کا دیوان رام پور کے کتب خانہ میں موجود و محفوظ ہے۔

شعراء اور بابر برابر بابر کے ساتھ رہتے تھے، اس کی ایک ادبی مجلس جالہ میں ہوئی، شیخ زین الدین، ملا علی خاں، تردی بیگ وغیرہ شعراء ساتھ تھے مجلس میں یہ شعر پڑھا گیا:

محبوبی ہر عشوہ گرے را چہ کند کس — جائے کہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

اس پر تمام شعراء فکر کرنے لگے، بابر جو ملا علی سے بہت بے تکلف تھا ان سے مخاطب ہوکر ہنستے ہوئے یہ شعر پڑھا:

مانند تو مدہوش گرے را چہ کند کس — گاؤ کسے مادہ خرے را چہ کند کس

لیکن فوراً ہی بیہودہ شعر کہنے کی وجہ سے دکھ ہوا کہ جب وہ مثنوی مبین جیسی مقدس چیز لکھ چکا ہے تو اس کی زبان سے ایسا بےہودہ شعر نہ نکلنا چاہیے، اسی وقت سے اس نے ہزل کہنا ترک کردیا۔

کابل کے مرغ زار میں وہ اپنے خوش طبع دوستوں اور شاعروں کے ساتھ عیش وعشرت کی بزم منعقد کرتا تھا، اسی مناسبت سے اس نے حسب ذیل شعر کہا جو آج بھی مقبول ہے، یہ شعر وہاں کے ایک حوض پر کندہ کرایا گیا:

نوروز و نو بہار و دلبرے خوش است — بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست[20]

تصانیف و تراجم: شاہان مغلیہ میں اکثر کو علم وعلماء سے بڑا لگاؤ تھا مگر صاحب تصانیف بہت کم تھے، ان کے اور ان کے عہد میں گوناگوں علمی کام انجام پائے اور متعدد مفید اور کارآمد کتابیں تصنیف و تدوین ہوئیں مگر ان سلاطین نے بذات خود کوئی علمی کارنامہ انجام نہیں دیا، بابر تنہا وہ مغل فرماں روا ہے جس نے بذات خود کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جس کی وجہ سے وہ آج بھی علمی حلقوں میں ممتاز ہے، ذیل میں اس کی تصنیفات کا مختصر تعارف درج ہے:

مثنوی مبین: یہ مثنوی بادشاہ بابر نے اپنے بیٹے کامران کے لیے ۹۲۸ھ میں ترکی زبان

میں تحریر کیا تھا جس میں مذہبی، فقہی، اخلاقی مسائل پر بحث کی گئی ہے، اس میں دو ہزار اشعار ہیں، یہ کتاب فقہ بابری کے نام سے بھی موسوم ہے، اس کی شرح شیخ زین الدین نے لکھی تھی مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ یہ کتاب صرف کامران کی تعلیم کی غرض سے ہی لکھی تھی اور اس کے دوسرے بیٹے ہمایوں کو اس کے ذریعہ مذہبی واخلاقی تعلیم نہ دلائی گئی ہو، جب کہ تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ مذہب واخلاق میں ہمایوں کی تربیت اعلا قسم کی ہوئی تھی، وہ صوم وصلاۃ کا سخت پابند تھا، کبھی وہ قسم نہ کھاتا تھا اور نہ کبھی فحش لفظ زبان پر لاتا تھا، کسی سے بہت خشمگیں ہوتا تو صرف لفظ سفیہ کہہ دیتا، معمولی احکام شرعی پر سختی سے عمل کرتا، مسجد میں داخل ہوتے وقت کبھی بایاں پاؤں اندر نہ کرتا اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدائے عزوجل کا کبھی نام نہیں لیا[21]، ممکن ہے کہ یہ سب باپ ہی کی تربیت اور اس مثنوی کا اثر ہو۔

اس کتاب کی تصنیف کے بعد بابر بہت سے منہیات کے ارتکاب سے باز رہنے لگا تھا، وہ خود لکھتا ہے کہ:

"پہلے اس سے جو کچھ برا کہنے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا، جب سے مبین کی نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں، حیف ہے کہ اس سے بے ہودہ لفظ بھی نکلیں اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین کھلیں، افسوس ہے کہ اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں، اسی دن سے ہزل کہنا ترک کردیا تھا، اس شعر کہتے وقت اصلاً خیال نہ رہا، ایک روز کے بعد بکرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہوگئی اور کھنکار میں خون آنے لگا، اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہ کس طرف سے ہے اور یہ تکلیف کیوں ہے، فمن نکث فانما ینکث علی نفسه ومن اوفی بما عهد علیه اللّٰه فسیؤتیه اجرا عظیما، میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹالیا، سچ یہ ہے کہ کسی گنہگار بندہ کے دل میں ایسے خیال کا پیدا ہونا ایک بڑی دولت ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جو بندہ اس طرح متنبہ ہوجائے وہ اس کو سعادت عظمیٰ سمجھے"۔[22]

تزک بابری: بابر کی تصنیف میں تزک بابری بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ کتاب غیر معمولی

طور پر مشہور و مقبول ہوئی، جو اپنی طرز کی ایک بے نظیر کتاب اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے، جو لفاظی اور مبالغہ سے خالی ہے، اس میں سنی سنائی باتوں کے بجائے آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ کی گئی چیزوں کا بیان ہے، مناظر فطرت، درختوں اور پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی اس کا مفصل ذکر ہے اور ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑی مفید باتیں درج ہیں، اس کتاب کو ہر ملک کے ارباب کمال، اہل علم بڑے ذوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں، یہ کتاب اصل میں ترکی میں لکھی گئی تھی، اس کا اصل نسخہ ریاست الور میں محفوظ ہے، ابوالفضل اور ملا عبدالقادر بدایونی وغیرہ نے اس کو ایک عمدہ تصنیف گردانا ہے اور یورپین مورخ بھی اس کی خوبیوں کے معترف ہیں، ہنری الیٹ لکھتا ہے کہ:

"بابر کی تزک ان سوانح عمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی کہی جاسکتی ہے یہ کسی طرح Expdtition of xenophon سے کم تر نہیں Commentaries of caesar سے کچھ ہی کم ہوسکتی ہے...... یہ کتاب نہ صرف تاریخی واقعات کے لیے اہم ہے، بلکہ اس میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ (یعنی بابر) کس قدر غیر معمولی دماغ کا آدمی تھا اور اس کا مشاہدہ کتنا قوی تھا، موجودہ دور کے سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ بابر نے کابل، فرغانہ اور ہندوکش کے شمالی علاقوں سے متعلق جو بیانات قلم بند کیے ہیں وہ اپنی صداقت اور تفصیلات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہیں اور ان میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا، ہندوستان کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے، اس ملک میں ۱۵۲۵ء میں وہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا، اس نے یہاں جو کچھ دیکھا اور پایا اس کو پچیس صفحوں میں تحریر کیا ہے، اس ملک کے نہ صرف حدود اربعہ، آبادی، آمدنی، ذرائع آمدنی وغیرہ کا صحیح صحیح حال لکھا ہے بلکہ یہاں کے پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں، چوپایوں اور آبی جانوروں کے عادات وخصوصیات سے متعلق اتنے مفید معلومات فراہم کیے ہیں کہ موجودہ دور کے ماہرین نباتات وحیوانات بھی ان سے پورا فایدہ اٹھا سکتے ہیں، ان چیزوں کے متعلق اپنے مشاہدات کا ذکر کرتا ہے اور پھر دوسروں سے جو

کچھ سنا تھا اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے، آخر میں ان چیزوں کی ترقی کے لیے اپنے ذاتی مشورے بھی پیش کرتا ہے"[۲۳]۔

اس کتاب کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس کے تراجم سے ہوتا ہے، دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا، سب سے پہلے فارسی میں اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خان خاناں نے کیا، اردو میں مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی نے منتقل کیا، فرانسیسی میں M.Pavet de-Courteille نے ترجمہ کیا اور کئی مشہور اہل قلم نے انگریزی قالب میں ڈھالا، A.D.Beveridge نے انگریزی ترجمہ میں مفید حواشی اور عمدہ ضمیموں سے اپنی کتاب کو مزین کیا جس سے اس کتاب کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس کتاب کے تراجم اور اس کے علمی معیار کی جانچ کے سلسلے میں جو تحقیقی کام اب تک ہوئے ہیں اس کی ایک لمبی فہرست اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ میں پیش کی گئی ہے۔

رسالہ والدیہ: یہ کتاب خواجہ عبید اللہ احرار کی مشہور تصنیف کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ ہے، بابر کو اپنے پیر و مرشد خواجہ صاحب سے غیر معمولی عقیدت تھی، جس کا اظہار اس کتاب کے ترجمہ سے بھی ہوتا ہے، یہ ترجمہ ۹۳۵ھ/۱۵۳۱ء میں کیا گیا جس کے وجوہ و اسباب خود بابر کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

"جمعہ کے دن تیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی، ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا، بہت دیر تک بے چینی رہی، دوسرے ہی دن ہفتہ کو بخار ہوا، کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت کو مقبول ہو، اس کے قبول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح قصیدہ بردہ مقبول ہوا اور اس کا کہنے والا مرض فالج سے اچھا ہوگیا، اسی طرح میں بھی تندرست ہوجاؤں، اسی نیت سے وزن، رمل، مسدس مخبون وضرب بھی مخبون محذوف میں جس میں مولانا عبدالرحمن جامی کا سبحہ بھی ہے رسالہ نظم کرنا شروع کردیا، اسی رات میں نے تیرہ سفر لکھ ڈالے، بطریق التزام ہر روز دس بیتوں سے کم نہ لکھیں، شاید کوئی دن ناغہ ہوا ہو، اگلے سال بھی اور کئی بار اور بھی ایسا بخار کم سے کم چالیس دن تک رہا ہے، خدا کی عنایت اور

حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن انتیسویں کو ذرا افاقہ ہو گیا اور پھر صحت ہو گئی، ہفتہ کے دن ربیع الاول کی اٹھارہویں تاریخ کو نظم تمام ہو گئی، ایک دن باون شعر ہوئے"۔[۲۴]

ایک بادشاہ وقت کا اپنے خواجہ کی عقیدت کو اپنی بیماری کی شفایابی کی دلیل سمجھنا یقیناً اس بات کا غماز ہے کہ وہ بادشاہ بھی جذبہ کامل اور ایمان خالص سے معمور ہو کر بندگان خدا کی راہ نمائی و رہبری کر رہا ہے، آپ غور کر سکتے ہیں کہ جب مثنوی مبین جو مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر ہے تو اس کے بعد ہزل کہنا ترک کر دیا، ایک شعر موزوں کیا تو ندامت ہوئی اور بیمار ہوا تو اسی کو من جانب اللہ تنبیہ سمجھا، طبیعت ناساز ہوئی تو اہل اللہ سے تعلق جوڑنے سے بیماری کے زایل ہونے کا سبب قرار دیا، یہ اس کے مذہبی شغف اور دین دار ہونے کا ثبوت ہے۔

دیوان بابر: بابر بلند پایہ انشاپرداز اور شاعر تھا، ترکی شاعری میں اس کا مرتبہ بہت بلند تھا، اگر چہ وہ مشکلات اور صعوبتوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آتے رہے تاہم جب تھوڑا سکون میسر ہوتا تو مشق سخن کرنے لگتا، غرض اس اتھل پتھل کے باوجود بھی اس نے اتنے اشعار کہے کی ایک مکمل دیوان تیار ہو گیا، اس کے علاوہ علم موسیقی، انشاپردازی میں بھی وہ بلند پایہ رکھتا تھا، اکبر نامہ میں ہے کہ:

"آں حضرت را در نظم و نثر پایہ عالی بود خصوصاً در نظم ترکی و دیوان ترکی، آں حضرت در نہایت فصاحت و عذوبت واقع شدہ و مضامین تازہ در آں مندرج است"۔[۲۵]

یہاں پر بابر کے چند اشعار سپرد قلم کیے جاتے ہیں:

ہلاک می کندم فرقت تو دنستم   وگر نہ رفتن ازیں سہر می نوانستم

تسخیر بیانہ کے وقت وہاں کے حاکم نظام خاں کے نام جو فرمان بھیجا اس میں یہ شعر بھی درج تھا:

با ترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ   چالاکی و مردانگی ترک عیاں است

گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش   آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیاں است[۲۶]

تاریخ فرشتہ میں بابر کا یہ شعر درج ہے جو بڑا ہی معنی خیز اور نصیحت آموز ہے:

باز اے ہمائے کہ بے طوطی خلعت   نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

درویشوں سے جو ہمدردی اور محبت بابر کو تھی اس کا غماز یہ شعر ہے:

درویشاں را گر چہ نہ از خویشانم   لیک از دل و جاں معتقد ایشانم

دور است مگوی شاہی از درویشے   شاہیم ولے بندۂ درویشانم[۲۷]

بابر کی شاعری میں صوفیانہ رنگ کے عاشقانہ اور خمریہ اشعار کے ساتھ زندگی کے عام مسایل و تجربات کا ذکر بھی ہے، بعض متقدم شعرا بالخصوص نوائی کا اثر بھی اس کے کلام پر ہے لیکن کسی کی کورانہ تقلید نہیں ملتی۔[۲۸]

رسالہ عروض: بابر نے علم عروض پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا تھا، یہ چغتائی یعنی ترکی زبان میں ہے، ۱۹۲۳ء تک اس رسالہ کا سراغ نہیں مل سکا، ابھی حال ہی میں ایم فواد کو بردنو کو پیرس کے ایک مخطوطے میں اس کا ایک نسخہ ملا ہے، اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ بعض اوزان نظم کے متعلق جو ترکی شاعروں نے استعمال کیے، اس کی دی ہوئی معلومات نوائی کی میزان الاوزان کی معلومات سے بہت زیادہ ہیں، اس میں بابر اپنے اشعار تحریر کرتا ہے لیکن اوزان میں جو اس کی ہی ایجاد ہیں وہ صرف ترک اشعار پیش کرتا ہے، اپنے دیوان کے آخر میں وہ لکھتا ہے کہ "رسالہ عروض فتح ہندوستان سے دو یا تین سال قبل ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء اور ۹۳۸ھ/۱۵۳۲ء کے درمیان پایہ تکمیل کو پہنچا"۔[۲۹]

خط بابری: بابر خطاطی کا بڑا قدرداں تھا، بلکہ خود بھی اس فن میں مہارت رکھتا تھا اور ایک نئے خط کا موجد ہے جو خط بابری کہلاتا ہے، اس طرز تحریر میں اس نے کلام مجید کے نسخے تیار کیے تھے جسے شرف قبولیت کے لیے مکہ معظمہ بھیجا تھا،[۳۰] بابر نے اس خط کو ۹۱۰ھ میں ایجاد کیا مگر اس کا لکھنا آسان نہ تھا، اس لیے مقبول نہ ہوا، عہد اکبری میں یہ خط مفقود ہو چکا تھا مگر خوش نویس اساتذہ اس خط میں لکھنا کمال فن سمجھتے تھے، اکبر کے دور میں میر عبدالحئی مشہدی اس خط کا با کمال استاد تھا، عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

"بابر اپنی تزک میں اساتذہ نستعلیق میں سے سلطان علی مشہدی کا ذکر کرتا ہے جو سلطان حسین اور اس کے وزرا کے لیے کتابیں لکھا کرتا تھا اور ان کتابوں کی تصویریں بہزاد اور شاہ مظفر تیار کرتے تھے"۔[۳۱]

فلکیات سے دل چسپی: علم فلکیات، علم رمل، علم جفر وغیرہ سے بابر کو غیر معمولی شغف اور دل چسپی

تھی اور دوان کا ماہر تھا، اس کا بیٹا ہمایوں بھی ان خوبیوں کا حامل تھا، اس کے دربار میں بھی فلکیات کے کئی ماہرین موجود تھے جن سے دوان کے متعلق معلومات حاصل کرتا تھا، سالک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"بابر کو فلکیات سے دل چسپی تھی، سمرقند کی رصدگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ اس رصدگاہ کی مدد سے الغ بیگ مرزا نے زیچ گورگانی بنائی جس پر اب تک انحصار کیا جاتا ہے، اس زیچ کی اشاعت سے پہلے زیچ ایل خانی کا استعمال عام تھا جو ہلاکو خاں کے زمانے میں مراغہ کی رصدگاہ کی مدد سے خواجہ نصیر نے مرتب کی تھی، ہلاکو خاں ایل خانی کہلاتا تھا، دنیا بھر میں سات آٹھ سے زیادہ رصدگاہیں موجود نہیں، ان میں سے ایک خلیفہ مامون رشید نے بنائی تھی جس میں "زیچ مالونی" کی ترتیب کی گئی ایک اور بطلیموس نے تعمیر کی تھی، ایک اور رصدگاہ ہندوستان کے راجہ بکرماجیت کے عہد میں تعمیر ہوئی، یہ ہندو راجہ سلطنت مالوہ (جس کو اب مانڈو کہتے ہیں) میں اجین اور دھار کا حکمراں تھا، ہندو اب تک اسی رصدگاہ میں تیار کی ہوئی زیچ استعمال کر رہے ہیں، حالاں کہ یہ زیچ سب سے زیادہ ناقص اور نامکمل ہے، اس رصدگاہ کو تعمیر ہوئے ۱۵۸۴ برس گزر گئے"۔[۳۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایک عالم اور بڑا مورخ تھا۔

بابر کا تعمیری ذوق شاہان مغل کو تعمیرات باغ بانی اور پھولوں سے بڑا شغف تھا، بابر کو ہندوستان میں زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا اور جس قدر موقع ملا وہ حکومت کو مستحکم کرنے اور ملک کی اصلاح اور دشمنوں کو زیر کرنے میں گزرا، اس لیے دوسرے شاہان مغل کی طرح اس نے کوئی عالی شان یادگار نہیں چھوڑی مگر اس کے باوجود بھی اس نے تعمیر و ترقی پر بڑی توجہ دی، اس کے یہاں بڑے بڑے سنگ تراش اور معمار جمع رہتے تھے، بابر لکھتا ہے کہ:

"صرف آگرہ میں اسی شہر کے جو سنگ تراش میرے محلوں میں کام کرتے تھے ان کی تعداد ۶۸۰ تھی اور آگرہ، سیکری، بیانہ، دھول پور، گوالیار اور کول میں روزانہ ۱۴۹۱ سنگ تراش میرے کاموں میں مصروف رہتے تھے"۔[۳۳]

شہزادی گل بدن بیگم نے ان تعمیرات کی تفصیل اپنی کتاب ہمایوں نامہ میں بیان کی ہیں جنھیں بابر نے اپنے لیے بنایا تھا، چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ:

"اعلیٰ حضرت بادشاہ نے آگرہ میں دریا کے کنارے پر متعدد عمارتیں تعمیر کرنے کے احکام جاری فرمائے، ایک سنگین محل اپنے ذاتی استعمال کے لیے بنوایا جس کا خلوت خانہ حرم اور باغ کے درمیان تعمیر ہوا، دیوان خانہ میں بھی ایک سنگین گھر بنوایا جس کے وسط میں حوض اور چاروں برج خانے میں چار کمرے تھے"۔ (ص ۲۷)

پھل اور پھول سے بابر کی رغبت پورے عہد مغلیہ میں ملک کو گل و گلزار بنانے کی کوششیں کی گئیں اور مختلف طریقوں سے ملک کو سنوارا گیا، بادشاہوں کو چمن بندی سے بڑی دل چسپی تھی جس کی ابتدا بابر سے ہوتی ہے، اس چمن بندی میں مختلف جگہوں کے پھول، پودے اور درخت لگائے گئے اور دارالحکومت کو ان سے زینت بخشی گئی، بابر نے جو باغ لگائے ان میں کابل کا باغ وفا اور باغ کلاں اور آگرہ کا رام باغ اور زہرہ باغ قابل ذکر ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ وہ گوالیار کی سیر و تفریح کے لیے گیا تو واپسی پر وہاں سے گلاب کے پودے بھی ساتھ لایا اور انھیں آگرہ میں لگایا۔

غیر مسلموں سے بابر کا برتاؤ پہلے گزر چکا ہے کہ ہندوستان مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، اس لیے اس نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے بدظن ہو کر غیر مسلم اس کی حکومت اور اس کے مذہب کے خلاف ہو جائیں، اس نے زور زبردستی سے اپنا مذہب کسی پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی، اس کے خیال میں اسلام کی اشاعت تلوار کی نوک سے نہیں بلکہ اخلاق اور عفو و درگذر اور رحم و کرم کے اوصاف سے کی جاسکتی ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے جبراً کسی کو مسلمان بنایا ہو یا اختلاف مذہب کی بنا پر لوگوں کا قتل کیا ہو یا ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا ہو[۳۴] اس کے برعکس جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہوتے اور وہ صاحب اقتدار ہوتے تو مسلمانوں کو تنگ کرتے اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچاتے، حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانے سے مغلوں کے آخری دور تک جو سلاطین ہندوستان میں گزرے ہیں چند ایک کو چھوڑ کر سب کی دل چسپی اشاعت اسلام سے کم اور ملک کے انتظام وانصرام سے زیادہ رہی، یہاں اشاعت دین کا کام صوفیہ اور بزرگان دین نے اپنے حسن اخلاق سے کیا۔

غیر مسلموں کی نظر میں بابر کی اہمیت بابر ہندوستان کے مقبول بادشاہوں میں تھا، جس طرح مسلمانوں نے اسے قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا، اسی طرح انصاف پسند غیر مسلموں اور برادران وطن نے بھی

بابر کی خدمات کو سراہا ہے، مشہور مورخ ڈاکٹر ایشور ٹوپا لکھتے ہیں:

"مغل دور میں دراصل اس بات کا چرچا اور پرچار ہوا کہ ہندوستان کی جانچ پڑتال، تعمیر اور پرداخت، بناؤ اور سجاؤ کل ہندی تہذیبی نقطہ نظر سے کی جائے، اس لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کو ایک خصوصی امتیاز حاصل رہا ہے، اس امتیاز اور خصوصیت کی وجہ مغلوں کی ذہنیت اور اٹھان تھا، سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسئلوں کے سمجھنے میں انہوں نے انسانی مسلک اور اصول کو برتا، عہد وسطیٰ کے تمام حکم رانوں میں مغل حکم راں ہی وہ لوگ تھے جن میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ معاملات کو انسانی نظر اور ہمدردی سے دیکھ سکیں، ان کی تمام تر کوشش اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ان کی اسپرٹ کی کارفرمائی اور ان کے عمل کا دائرہ اور وسیع تھا، ہر کام کی انجام دہی میں اس کسوٹی کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اس خاندان کا آغاز بابر سے ہوتا ہے جو بہادری، جفاکشی، سپاہ گری، علمی ذوق، ندرت پسندی، سچی دوستی اور ہمدردی جیسی انسانی خوبیوں کا ایک زندہ نمونہ تھا، اس کی شخصیت کے مختلف رویوں کا اندازہ "تزک بابری" سے بہ خوبی لگتا ہے، اس کی زندگی آزمائش اور جستجو کی یادگار ہے، مصیبتیں، تکلیفیں اور کٹھنائیاں بابر کی زندگی میں تہذیبی سہاگے کا کام دے گئیں، گویا بابر نے ہندوستان پر تھوڑے عرصہ ہی حکومت کی لیکن اس کی سیاسی فطرت اور انسانی نظر نے بھانپ لیا کہ ہندوستان میں مغل حکومت کا استحکام اور پائیداری محض جہاں گیری قوت سے نہیں ہو سکتی، اس کے ذریعہ سے حکومت کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوتیں، ایسی بے بنیاد حکومت کا شیرازہ جلد سے جلد بکھر سکتا ہے، اس کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ مغل راج ایک اصلیت ہو جائے گا، ایسے راج کے قیام اور اس کے استحکام میں بابر کی انسانی قوت اس کی رہنما ہی نہ بنی بلکہ مغل حکمرانوں کی انسان پسندی بھی کام آئی، شروع شروع میں بابر کو اس ملک سے نہ کوئی ہمدردی تھی اور نہ دل چسپی، نہ اس ملک کی فضا نے اس کو متاثر کیا اور نہ اس کے لوگ اور اداروں نے اس کے دل کو موہ لیا، وہ اجنبیوں کے ملک میں اپنے کو فاتح سمجھتا تھا لیکن بابر کی انسانی فطرت اور نظر کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے اجنبیوں کو اپنا لیا، اس نے وہ کام انجام دیا جو مغل کارنامہ سے

تعبیر کیا جاتا ہے، تزک بابری میں اس نے اپنی اور ہندوستان کی سچی تصویر کھینچی ہے جس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں تبدیلی کیوں کر ہوتی ہے، بابر کے آخری زمانے میں ہندوستان نے اس کے دل میں جگہ کی اور اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ ملک نفرت کے قابل نہیں بلکہ اپنا ہو سکتا ہے، جیسے جیسے اس کی زندگی کے دن اس ملک میں بیتتے گئے ویسے ویسے وہ ہندوستان کی اصلیت اور خوبی سے مرعوب ہوتا گیا"۔[۳۵]

بابر کی وفات اور قدرت کا کرشمہ کہا جاتا ہے کہ وفات سے قبل بابر کو خبر ملی کہ اس کا بیٹا ہمایوں جو سنبھل کی مہم پر تھا سخت علیل ہو گیا ہے، بابر نے حکم دیا کہ اسے فوراً آگرہ لایا جائے، یہاں پہنچا تو اسے سرسام ہو گیا، بیٹے کی حالت دیکھ کر بادشاہ سخت مضطرب ہوا، اسے اندیشہ ہوا کہ چھوٹا لڑکا تو جاتا رہا کہیں اس ہونہار بیٹے سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑے، علاج معالجہ سے جب افاقہ نہ ہوا تو دربار کے مخصوص مقربین نے کہا کہ آپ کے نزدیک جو چیز سب سے زیادہ قیمتی ہو، اسے نذرانہ کے طور پر راہ خدا میں دے دیں، بعض نے کوہ نور ہیرا کو صدقہ کرنے کا مشورہ دیا مگر بابر نے ان تمام چیزوں کے بجائے خود اپنے وجود کو اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے قربان کر دینے کو مناسب سمجھا، لوگوں نے اس سے روکا مگر اس کا ارادہ مستحکم تھا، چنانچہ رسم کے مطابق مریض کی چارپائی کے گرد تین مرتبہ چکر لگایا اور اس سے قبل وہ دو رکعت نماز ادا کر کے بیٹے کی صحت یابی کے لیے خود کو راہ خدا میں پیش کر دیا اور دعا کی کہ خداوندا تو میرے بیٹے کی جاں بخشی کر دے اور اس کے عوض مجھے اٹھا لے، اس چکر کے بعد ہمایوں حرکت میں آنے لگا مگر بابر کی طبیعت میں تبدیلی اور بے چینی شروع ہوئی، غرضیکہ ہمایوں تو اچھا ہو کر اپنی مہم پر واپس لوٹ گیا مگر بابر کی صحت روز بہ روز خراب ہوتی چلی گئی اور وہ ۲۶/ دسمبر ۱۵۳۰ء/ ۹۳۶ھ کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا، اس وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی، اس نے اس مختصر سی عمر میں ۳۶ سال ۸ ماہ ۲ یوم حکومت کی جس میں ۴ سال ۲ ماہ اور ایک یوم ہندوستان پر حکم راں رہا۔[۳۶]

بابر کی خواہش اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو کابل کے ایک پہاڑ پر دفن کیا گیا ہے۔[۳۷] گو بابر کی وفات ہو گئی مگر وہ اپنی ان آٹھ خصوصیات کی بنا پر آج بھی لوگوں کے دلوں پر حکم رانی کر رہا ہے اور زندہ ہے، اعلا قوت فیصلہ، شریفانہ اولوالعزمی، فتح یابی، حکم رانی، رعایا کو خوش حال بنانے کا جذبہ، خلق خدا پر نرمی، سپاہیوں کا دل جیت لینا اور انصاف سے محبت کرنا۔[۳۸]

اخلاق و اوصاف بابر کی آپ بیتی سے اس کی محبوبیت، شخصیت کی عظمت، ایمان داری، قوت کار، صلاحیت وغیرہ کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے، اس کی ابتدائی زندگی کی مشکلات نے اس کو بہادر، جفاکش اور سخت جان بنا دیا تھا، اس کے اندر ہمت و حوصلہ اور مہم جوئی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر گیا تھا، اس کے ترکی امرا نے اس کو بابر (شیر ببر) کا خطاب دیا تھا اور وہ اپنے دشمنوں پر شیر کی طرح جھپٹتا تھا، وہ حیرت انگیز خود اعتمادی اور قوت ارادی کا مالک تھا، اس کا ارادہ بہت مصمم ہوتا تھا، اس میں سنگین بحران پر قابو پالینے اور پرخطر موقع کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی، وہ ایک نہایت مہذب اور شایستہ شخص تھا، خدا پر کامل ایمان رکھتا تھا، عبادت گزار، پابند شریعت تھا، صوم و صلاۃ کی ادائیگی میں تساہل نہیں برتتا تھا وہ متعصب نہیں تھا، وہ بہت کم سنگدلی کا مظاہرہ کرتا تھا اور مجموعی طور پر مہربان، فیاض اور شریف النفس واقع ہوا تھا، اس نے علم و ادب کی ایسی آبیاری کی جس کی نظیر نہیں ملتی، اس کے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے اس کے عہد اور دربار میں ملک و بیرون ملک کے مشاہیر علما موجود تھے جو اپنے اپنے فن میں جولانی طبع دکھاتے تھے اور وہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا، وہ ایک قابل جنرل اور فوجی حکمت عملی میں مہارت رکھتا تھا، بہت کم مدت میں اس نے شمالی ہند کو فتح کرلیا، وہ پرجوش اور فصیح تقریروں سے اپنے ساتھیوں اور فوج کی ہمت و حوصلہ بڑھا دیتا اور انہیں پر اعتماد بنا دیتا تھا، فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس نے افغانوں کی طاقت کو تباہ کرکے اور راجپوتوں کی ریاست کو کمزور کرکے مغل سلطنت کی بنیاد رکھی، بے وقت موت نے اسے مہلت نہ دی کہ وہ اپنی فتوحات کو مستحکم کرسکے، اس کی وجہ سے اس کے بیٹے ہمایوں کو اپنے باپ کے مشن کو آگے بڑھانے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔[۲۹]

خلاصۂ کلام بابر کے برخلاف ابراہیم لودھی کا رویہ اپنے امرا اور عوام کے ساتھ اچھا نہ تھا، ابراہیم ان سے درشت لہجہ میں ہم کلام ہوتا تھا اور انہیں برا بھلا کہتا تھا، اس کی غلط روش کی بنا پر لوگ اس سے ناراض رہتے تھے اور اس کے قریب ترین اشخاص بھی اس سے الگ ہوگئے اور بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، ان کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ وہ آکر ملک میں امن و امان کی فضا قائم کرے، ان کا خیال تھا کہ ملک میں امن کا ماحول قائم کرکے بابر واپس چلا جائے گا مگر بابر ملک کو فتح کرکے یہیں رہ بس گیا، اگر ابراہیم لودھی کا رویہ ٹھیک ہوتا تو بابر ہندوستان پر اتنی جلد اور آسانی سے قبضہ نہیں کرسکتا تھا، اس نے جب ملک پر حکومت کی تو اس کی نظر میں امرا، غربا اور عوام برابر تھے، وہ سب کو عزت کی نگاہ سے

دیکھتا تھا، اس نے ہندو مسلم کی تفریق نہیں کی بلکہ سب کی ضرورت کا پورا خیال رکھا، اپنے مذہب کی اشاعت میں زور و جبر سے کام نہیں لیا، اس کے آتے ہی ملک میں خوش حالی آگئی، مفلوک الحال لوگوں کے اندر بھی خوش حالی کی لہر دوڑ گئی، اگر بابر کو طویل عمر ملتی اور لمبے عرصے تک حکومت کرنے کا موقع ملا ہوتا تو ملک کا نقشہ ہی بدل جاتا، بعد کے مغل حکمرانوں کا طریقۂ حکومت بھی عمدہ اور بہتر تھا مگر ان کو وہ مقام نہ مل سکا جو بابر کو حاصل ہوا، بابر کا مطالعہ سنجیدگی اور بے تعصبی سے کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالے

۱ ہندی ادب کے بھکتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات، ڈاکٹر سید اسد علی ترجمہ اردو ڈاکٹر ماجدہ اسد، ص ۳۷، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۹۱ء دوسرا ایڈیشن ۲ ایضاً ص ۳۸ ۳ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ مترجم عبدالحی خواجہ، ص ۹۷-۵۹۶، مکتبہ ملت دیوبند ۱۹۸۳ء ۴ مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبدالمجید سالک، ص ۲۷۹، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور ۱۹۹۷ء، رود کوثر، ص ۲۳ ۵ ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، ڈاکٹر ایشور ٹوپا، ص ۱۱۵، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ ۱۹۶۲ء ۶ تذکرۃ الواقعات، جوہر ترجمہ انگریزی، ص ۲۲-۱۲۱، بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۴۸۰ ۷ تاریخ رشیدی، حیدر مرزا مترجمہ ان-ایس-وائی-ڈی راس، ص ۱۵۵-۵۳، بحوالہ بزم تیموریہ سید صباح الدین عبدالرحمن، ص ۵، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۸ء ۸ دولت المغول فی الہند، ص ۱۳، ۹ منتخب التواریخ فارسی، ملا عبدالقادر بدایونی، ص ۳۳۱، ج ۱، مطبوعہ کلکتہ ۱۰ بزم تیموریہ، ص ۲۲ ۱۱ دولت المغول فی الہند ۱۲ بزم تیموریہ، ص ۲۱ ۱۳ ہندوستان کے سلاطین علما و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص ۲۲، مکتبہ معارف، اعظم گڈھ ۱۹۶۴ء ۱۴ مکتوبات قدوسی، ص ۳۳۷، مطبع مدنی، بحوالہ اقبال کے محبوب صوفیہ، اعجاز الحق قدوسی، ص ۴۴۳، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۲ء دوسرا ایڈیشن، مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص ۶۲ ۱۵ بزم تیموریہ، ص ۶ ۱۶ تاریخ فرشتہ، تزک بابری، ص ۱۶۹، مطبوعہ بمبئی ۱۷ بزم تیموریہ، ص ۲۳ ۱۸ بابر نامہ، بیورج، ۵۱۸، ظہیر الدین محمد بابر، ص ۷۷-۱۷۶ ۱۹ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ۵۳۰، اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ص ۸۱۸ ۲۰ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بزم تیموریہ، ص ۱۹-۱۸ ۲۱ ایضاً ص ۲۵ ۲۲ تزک بابری بیورج، ص ۲۵۳، بزم تیموریہ، ص ۲۰ ۲۳ تاریخ ہند، ہنری ایلیٹ، ص ۲۰-۲۱۸، بحوالہ بزم تیموریہ، ص ۱۳-۱۲ ۲۴ تزک بابری (اردو) ص ۳۳۶، بحوالہ بزم تیموریہ، ص ۱۶ ۲۵ اکبر نامہ، ص ۱۱۸، ج ۱، بحوالہ بزم تیموریہ، ص ۱۵ ۲۶ تاریخ فرشتہ (اردو) ص ۵۹۸، ج ۱، تزک بابری بیورج، ص ۲۹۸ ۲۷ تفصیل کے

مقدمہ بزم تیموریہ، ص ۱۴۰۵ ۲۸ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ص ۸۱۸ ۲۹ ایضاً ص ۸۱۷ ۳۰ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۹۹، منتخب التواریخ، ص ۳۴۳، رود کوثر ۳۱ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۹۹ ۳۲ تزک بابری، ارسکن، ص ۵۱، بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۱۱ ۳۳ تزک بابری، ارسکن، ص ۳۲۴، بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۷۲ ۳۴ مسلم حکومتوں کی رواداری، احمد، ۱۲۹، ادارہ تاج المعارف، دیو بند ۳۵ ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص ۱۱۵-۱۱۳ ۳۶ واقعات دار الحکومت دہلی، بشیر الدین، ص ۳۳۵، ج ۱، اردو اکیڈمی دہلی، ۱۹۱۹ء ۳۷ ایضاً، تزک بابری، ظہیر الدین محمد بابر، منتخب التواریخ، منتخب اللباب، ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد، رود کوثر، مسلم حکمران، ہمایوں نامہ، اکبر نامہ، خلاصۃ التواریخ، دولت المغول فی الہند میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے ۳۸ بابر کی کل سات بیوی تھیں، عائشہ بیگم، زینب بیگم، ماہم بیگم (سب سے محبوب بیوی)، معصومہ سلطانہ بیگم، گل رخ بیگم، دلدار بیگم اور مبارکہ بیگم، بابر کی اولاد میں ہمایوں سب سے بڑا بیٹا تھا [illegible]، اس کے علاوہ کامران، عسکری اور ہندال مرزا ہمایوں کے بعد پیدا ہوئے، ایک بیٹی گلبدن بیگم، بڑی عالم اور فاضل تھیں (دولت المغول فی الہند، ص ۱۴) ۳۹ ظہیر الدین محمد بابر، ص ۲۲۳ ۔

❀❀❀❀❀

موازنہ انیس و دبیر (علامہ شبلیؒ)

یہ علامہ شبلی کی مشہور و مقبول ادبی تصنیف ہے، جس میں پہلے مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ میر انیس کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، میر صاحب کا کلام فصاحت و بلاغت، بندش کی صفائی، ترکیب کی دل آویزی، برجستگی، سلاست، روانی، روزمرہ و محاورہ، مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کے استعمال، تشبیہات و استعارات، ترتیب کی دل آویزی، واقعہ نگاری اور جذبات و احساسات اور منظر قدرت کی مصوری وغیرہ کا بہترین نمونہ ہے، اس کے آخر میں میر صاحب کا موازنہ مرزا دبیر سے کر کے دکھایا ہے کہ وہ میر صاحب سے کم درجے کے شاعر اور مرثیہ نگار تھے۔

دارالمصنفین نے اس کتاب کا نیا تحقیقی ایڈیشن شائع کیا ہے جو بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔

قیمت: ۱۱۰ روپے

بعض جدید طبی مسایل اوران کا شرعی حکم[1]

از:- مولوی عبدالمبین عبدالخالق ندوی☆

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "علّم الانسان مالم یعلم" (العلق ۵) (اللہ نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا) امام شافعیؒ کا قول ہے "العلم علمان علم الفقہ للادیان وعلم الطب للابدان" (مفتاح السعادہ، ص ۱، ۲۶۷) (علم درحقیقت دو ہیں، ایک علم فقہ، دین جاننے کے لیے اور دوسرا علم طب، جسمانی علاج کے لیے) جب دین سے رشتہ مضبوط تھا تو ان دونوں علوم میں مطابقت تھی مگر اب جوں جوں طبی میدان میں حیرت انگیز طور پر ترقی ہوتی جا رہی ہے اسی قدر نئے نئے مسایل بھی مسلم معاشرہ میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی حلت و حرمت کا مسئلہ دین سے بعد اور روح دین سے بے خبری کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بہت پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے، علاوہ ازیں گزشتہ صدی میں ایسے علوم و فنون پیدا ہوگئے ہیں جو براہ راست عقیدہ و ایمان سے ٹکراتے ہیں اور کچھ نئی ایجادات وانکشافات بھی سائنس کے دوش پر سوار ہو کر خلق خدا کو گمراہ کر رہی ہیں، جن کو دور جدید کی ترقی اور سائنس کی برکت سمجھ کر بہت سے اہل ایمان بھی حلال و حرام کی تمیز کے بغیر انہیں قبول کر لیتے ہیں، لہٰذا یہ سارے امور اس بات کے متقاضی ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی روشنی میں ان کا ایسا حل پیش کیا جائے جو سبھی کے لیے قابل قبول ہو، چوں کہ اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعہ روز اول سے ہر دور کی رہنمائی و سرپرستی کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے اس لیے یہاں اسی کی روشنی میں پیش آمدہ جدید طبی امور اور ان سے پیدا شدہ مسایل کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں سے کچھ تو بالکل حرام ہیں اور کچھ طبی ایجادات قابل قدر ہیں جن سے استفادہ اسلامی حدود

---

[1] یہ مقالہ ۲۸ ویں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس منعقدہ پاکوڑ (جھارکھنڈ) کے فقہی سمینار میں پڑھا گیا۔

☆ استاذ جامعہ ریاض العلوم، دہلی و مدیر مرکز الدعوۃ والبحوث العلمیۃ، اسعد نگر۔

ضابطے میں رہ کر کیا جاسکتا ہے۔

۱- رحم مادر کی تجارت اور اسلامی احکام صنف نازک جو دراصل ماں، بہن اور بیوی کے روپ میں مرد کی غم گسار ہوتی ہے اور جس کے متعلق رسول اللہؐ نے خاص طور پر ہدایت فرمائی ہے کہ اتقوا اللہ فی النساء (ابن ماجہ) (عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو)۔

مگر آج اس کے ساتھ ہر ظلم و جبر روا رکھا جاتا ہے اور اسے صرف بچہ بنانے کی مشین سمجھا جانے لگا ہے اور نوبت بایں جارسید کہ اس کے رحم کی بھی تجارت کی جانے لگی ہے جس کو انگریزی میں سروگیسی (Surrogasey) متبادل ماں کہتے ہیں۔

اگر کسی سبب سے کسی عورت کو بچہ پیدا نہیں ہوتا ہے تو دوسری تندرست عورت کو کچھ معاوضہ دے کر اس کی خدمات حاصل کرلی جاتی ہیں اور اس میں طریقہ یہ اپنایا جاتا ہے کہ بانجھ اور بے اولاد عورت کے انڈے کو شوہر کے نطفے سے ایک تشتری میں سائنٹفک طریقے سے فرٹیلائز کرتے ہیں اور اس نطفے کو دوسری تندرست عورت کے رحم میں داخل کردیتے ہیں اور وہ عورت حاملہ ہوجاتی ہے اور وقت متعینہ پر بچہ پیدا ہوجاتا ہے جس میں تمام جینی خواص شوہر کے پائے جاتے ہیں مگر ناقابل حل مسایل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب دوسری عورت کے رحم کو ایسے مرد کے نطفے سے فرٹیلائز کیا جائے جو اس کا شوہر نہ ہو تو شرعی طور پر یہ قطعاً ناجائز ہے بلکہ باطل اور حرام ہے، کیوں کہ ایک مرد کا نطفہ غیر عورت کے رحم میں داخل کرنا زنا کے مترادف ہے، اس طرح گویا رحم مادر کی تجارت ہوئی جس کی کوئی گنجایش اسلام میں نہیں لیکن اس جدید زمانہ میں یہ مغرب کی دین ہے جس سے پورا معاشرہ اتھل پتھل ہو رہا ہے اور اس طریقے سے پیدا ہونے والا بچہ ماں باپ کی شفقت و محبت سے محروم رہتا ہے، اس کی حرمت کے اسباب یہ ہیں:

۱- یہ اللہ کے متعین کردہ طریقہ تولید میں براہ راست مداخلت ہے، ۲- یہ عمل عورتوں کے لیے ایک بہانا بن جائے گا کہ وہ اپنے رحم کو پیسوں کی لالچ میں بے جا طریقہ سے استعمال کریں، ۳- صحت مند عورتیں دردزہ کی تکلیف سے بچنے کے لیے سروگیٹ ماں کی تلاش کریں گی، ۴- رحم کی تجارت کرنے والی عورت اس جوڑے سے جس کا بچہ اس نے جنا ہے، کوئی اور مطالبہ کرسکتی ہے کہ یہ بچہ [illegible]۔

۵ مارچ ۲۰۰۴ء کے راشٹریہ سہارا اردو میں یہ خبر چھپی ہے کہ امریکہ کی ایک خاتون نے اس کا مطالبہ کیا بھی ہے، ان کے علاوہ بھی اس سے اور متعدد پیچیدگیاں اور گوناگوں مسایل پیدا ہوں گے، خونی رشتوں میں انتشار پیدا ہوگا اور وراثت کے مسایل الگ پیدا ہوں گے، اسلام سائنس کی ترقی کے خلاف نہیں ہے لیکن اس کی نگاہ مسایل کے تمام پہلوؤں پر رہتی ہے، اس لیے اس کے احکام اعتدال و توازن پر مبنی ہوتے ہیں، چنانچہ علمائے اسلام نے اسے ہر حال میں ناجائز قرار دیا ہے اور اسے شریعت کے خلاف بغاوت تصور کیا ہے، رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی نے رحم مادر کی تجارت کی متعدد شکلیں بیان کرنے کے بعد چند طریقوں کو صحیح اور باقی کو حرام قرار دیا ہے اور شیخ ابن بازؒ نے دینی جذبہ رکھنے والوں کو مذکورہ طریقہ نہ اختیار کرنے کی نصیحت کی ہے۔ (فقہی فیصلے، ص: ۱۲۰-۱۲۶، ناشر: اسلامی فقہ اکیڈمی، دہلی)

۲- ایڈز کی شرعی حیثیت ایڈز ایک مہلک پیچیدہ وبائی مرض ہے جو مخصوص وائرس کے نتیجہ میں زندگی کو تباہ کردیتا ہے، یہ آج بھی ناقابل علاج بنا ہوا ہے جس کے خوف سے پوری دنیا لرزہ براندام ہے اور جو لوگ اس مرض میں گرفتار ہوجاتے ہیں وہ سماج کے ڈر سے نہ تو علاج کراتے ہیں اور نہ اسے ظاہر کرتے ہیں، اس کے لیے موثر ادویہ کی تلاش جاری ہے لیکن اس پر ابھی تک قابو نہیں پایا جاسکا ہے، یہ مرض جہالت و ناخواندگی کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل کر ہندوستان میں بھی داخل ہوچکا ہے، ذرائع ابلاغ نے مرض کی حیثیت سے اس کا تعارف کرارہا ہے لیکن یہ نہایت قدیم بیماری ہے جس کا تذکرہ قدیم طبی کتابوں میں قوت مدافعت ختم ہوجانے والی بیماری کے نام سے ملتا ہے مگر اسے اب تک چھوت کی بیماری سمجھا جارہا ہے حالاں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ مرض .H.I.V (Virous) وائرس کے ذریعہ انسانی جسم میں پھیلتا ہے جو ابتدا میں تو بہت معمولی اور غیر موثر ہوتا ہے، ایڈز کا پورا نام (Aquired Immune Deficiency syndrome) ہے، اس کے وائرس کی اطلاع پہلی بار امریکہ کے سنٹر فار ڈیزیز کنٹرول کے سائنس دانوں نے ۱۹۸۱ء میں دی تھی، پھر ۱۹۸۳ء میں فرانس کی روح دھانی پیرس میں ڈاکٹر مونٹگیر نے ایڈز کے وائرس کی شناخت کا دعویٰ کیا اور اس کا نام (.A.L.V) رکھا، اگلے ہی سال ۱۹۸۴ء میں امریکی سائنس داں گیلی نے اس وائرس کی کھوج کی۔

علامات: تھکاوٹ کا محسوس ہونا، بھوک نہ لگنا، وزن کم ہونا، بخار، کھانسی، خارش، جسم میں گلٹیاں پڑ جانا وغیرہ اس کی علامات ہوتی ہیں، اطبا کہتے ہیں کہ بعض لوگوں میں اس کی علامتیں دس سال تک ظاہر نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس وقت اپنا اثر دکھاتی ہیں جب قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے وائرس انسانی جسم میں داخل ہو کر ٹی (T) خلیوں کو تباہ کرنے لگتے ہیں جو جسم میں مدافعت کا کام کرتے ہیں۔

ایڈز کس طرح سے پھیلتا ہے؟: اس مرض کا وائرس زیادہ تر خون اور مادۂ تولید میں پایا جاتا ہے، چنانچہ جب ایک شخص اپنے خون کا عطیہ کسی کو دیتا ہے یا کوئی غلط جنسی تعلق قایم کرتا ہے یا لواطت کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا اس سے متاثر ہو جاتا ہے، ایک ہی سرنج (Syringe) سے کئی لوگوں کو انجکشن لگانے سے بھی یہ پھیلتا ہے، اس سے بچنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جنسی بے راہ روی سے آدمی پرہیز کرے اور اگر اسے خون دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس بات کا اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ اس کے خون میں ایڈز کے وائرس تو نہیں ہیں اور اسی طرح مستعمل بلیڈ (Blade) سے بھی پرہیز کریں۔

ایڈز سے متاثرین کی تعداد: اقوام متحدہ کے ادارہ برائے انسداد ایڈز کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ ایک سال میں ایڈز کے ذریعہ ساٹھ لاکھ لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں جن میں تیس لاکھ افراد مشرقی یورپ و افریقہ کے تھے، آج پوری دنیا میں ان کی تعداد ایک کروڑ پچانوے لاکھ سے متجاوز ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ایڈز سے متاثر افراد کی تعداد میں ہر سال بیس فیصد اضافہ ہو رہا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ حکومت اس مہلک بیماری سے بچنے کی ہدایت کرتی ہے لیکن جنسی انارکی اور طوائفوں کے اڈے ملک کے ہر حصہ میں بدستور قائم ہیں، مثال کے طور پر صرف ممبئی میں ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زاید طوائفیں ہیں ان میں سے ہر ایک اوسطاً روزانہ چھ سات مردوں سے ہم بستری کرتی ہیں، جس سے اس مرض کو بے تحاشا بڑھاوا ملتا ہے، ہندوستان کی شہری آبادی کا ۲۸ فیصد حصہ اس سے متاثر ہے جب کہ ہندوستان کی ۷۵ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے جہاں شہروں کی طرح علاج کی جدید سہولتیں میسر نہیں ہیں، اس لیے ایڈز آج بھی ان کے لیے ایک نامانوس لفظ بنا ہوا ہے اور بڑی تیزی سے ملک کے ہر حصہ میں پھیل رہا ہے، اس کا علاج کیا ہے یہ ہمارے

موضوع سے خارج ہے البتہ شرعی احکام کیا ہیں، اس کی مختصر وضاحت پیش ہے۔

ایڈز کے شرعی احکام: علما نے ایڈز کی مختلف شکلیں اور اسباب بیان کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱- جنسی عمل یا خون دینے سے اگر مرض واقعتاً دوسروں تک منتقل ہوتا ہے تو مریض پر لازم ہے کہ ایسے کسی بھی عمل سے احتراز کرے جو دوسروں تک انتقال مرض کا موجب ہو، چنانچہ اگر کسی ایسے مریض نے اس مقصد سے جنسی عمل کیا یا اپنا خون کسی کو دیا اور بیوی کو یا جس کو خون دیا ہے، ایڈز کی بیماری لاحق ہو جائے تو شرعاً وہ شخص مجرم و قابل تعزیر قرار پائے گا اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔

۲- اور اگر قصداً ایسا نہیں کیا ہے مگر جانتا ہے کہ یہ عمل دوسرے کو مریض کر دے گا تو شرعاً گناہ گار اور مجرم ہوگا، البتہ پہلے کے مقابلے میں یہ جرم ہلکا سمجھا جائے گا۔

۳- تیسری صورت اضطرار کی ہے مثلاً مریض کے گروپ کا خون کہیں دست یاب نہیں اور بغیر خون دیے اس کی جان بچنی ممکن نہیں، ایسی صورت میں اگر کسی نے انسانی ہمدردی کے اقتضا سے خون دیا تو وہ قابل مواخذہ نہ ہوگا، البتہ اسے خون لینے والے کو اصل صورت سے مطلع کر دینا چاہیے۔ (طبی اخلاقیات، ص:۱۸۹)

ایڈز کی وجہ سے فسخ نکاح: اگر کسی مسلمان عورت کا شوہر ایڈز کا مریض ہے مگر اس کی بیوی کو یہ مرض لاحق نہیں اور انتقال مرض کے خوف سے اس عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ رہنا ممکن نہیں تو ایڈز ان عیوب میں شامل مانا جائے گا جو تفریق کا سبب ہوتی ہیں، یعنی اس مرض کی بنا پر عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے، یہ مسلک مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک شوہر کے نامرد یا مقطوع الذکر ہونے کے سوا کسی اور صورت میں عورت تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے۔ (ہدایہ ۲۰۱/۲) اسی طرح اگر ایڈز کے مریض نے اپنا مرض چھپا کر کسی عورت سے نکاح کر لیا تو بھی اسے فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا گو اس میں تفصیل ہے تاہم بنیادی طور پر اس کی دو شکلیں ہیں

۱- یہ مرض جنسی اعتبار سے ایک کو دوسرے کے لیے ناقابل انتفاع بنا دے۔

۲- وہ مرض جو قابل نفرت ہوں اور ان کے متعدی ہونے کا اندیشہ ہو جیسے برص و جذام و جنون وغیرہ، اسی پر متاخرین علما کا فتویٰ ہے۔ (دیکھیے: سبل السلام، ص: ۱۳۲/۱، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ص: ۱۸۰/۴)

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سوائے امام ابوحنیفہؒ کے جمہور کے نزدیک ایڈز ان امراض میں شامل ہے جن کی وجہ سے عورت کو حق تفریق حاصل ہے، کیوں کہ یہ مرض برص، جذام سے بھی زیادہ خطرناک و متعدی ہے اور جنسی ربط میں مرض کی منتقلی کا سبب بھی ہے، اس لیے ایڈز زدہ شوہر سے بیوی اپنی جنسی تسکین حاصل نہیں کرسکتی ہے، بنابریں وہ نامردی کے حکم میں ہے۔

ایڈز کے مریض بچوں کا اسکول میں داخلہ: ایڈز کے شکار چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں، ان کے متعلق عمومی رائے یہ ہے کہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کے باوجود انہیں تعلیم سے محروم نہ کیا جائے، کیوں کہ تعلیم ان کا بنیادی حق ہے جس کے لیے علاحدہ ادارے اور اسکول بھی قایم کیے جاسکتے ہیں مگر ایڈز کا مرض خون کی منتقلی یا جنسی تعلق سے ہوتا ہے لیکن ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے یا ملنے سے نہیں پھیلتا اس لیے اسکولوں میں ان کے داخلے میں قباحت نہیں ہے، جب کہ کیرلا کے دو متاثر بچوں کو اسکول سے اسی بنا پر نکال دیا گیا اور تمل ناڈو میں ایڈز کے قریب المرگ نوجوان کو زندہ دفن کرنے کی کوشش کی گئی، نیز مہاراشٹر (جت تعلقہ) کی بے یار و مددگار بیوہ عورت جس کا شوہر ایڈز سے مرچکا ہے اور بیٹا جو اس مرض سے محفوظ ہے دونوں کا سماجی بائی کاٹ کیا گیا ہے۔ (۲۰ر دسمبر ۲۰۰۳ء، عالمی سہارا، ص: ۲۷)

ایڈز کی بنا پر اسقاط حمل اگر حالت حمل میں بچہ پیٹ میں ایڈز کا شکار ہو جائے تو اس سلسلہ میں علما کی رائے ہے کہ جنین میں روح ۱۲۰ دن کے بعد پھونکی جاتی ہے، اگر روح پیدا ہوچکی ہے اور بچے کے ایڈز سے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تب بھی اسقاط جایز نہیں، نفخ روح کے بعد اسقاط حمل کی حرمت پر اجماع و اتفاق ہے، شیخ الاسلام حافظ احمد بن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں: "اسقاط الحمل حرام باجماع المسلمین" (فتاوی ابن تیمیہ، ص ۳۴/۲۱۷)، (اسقاط حمل بالاجماع حرام ہے)۔

شیخ احمد علیش مالکی لکھتے ہیں: "التسبب فی اسقاطه بعد نفخ الروح فیه محرم اجماعا وهو من قتل النفس" (فتح العلی المالک، ص ۹۹/۱) (روح پڑنے کے بعد اسقاط حمل کی تدبیر کرنا بالاتفاق حرام ہے اور یہ قتل نفس کے حکم میں ہے) البتہ روح پڑنے سے پہلے بعض فقہا کے نزدیک اسقاط کی گنجایش ہے، جس طرح کہ باپ میں اگر اتنی استطاعت نہ

ہو کہ دوسری عورت سے بچے کو دودھ پلواسکے تو والد کی غذائی ضرورت سے تحت حمل کا اسقاط کرا سکتا ہے کیوں کہ بچہ کا موروثی طور پر ایڈز کے ساتھ پیدا ہونا اس سے شدید تر عذر ہے لیکن یہ اجازت بھی روح پڑنے سے پہلے کے لیے ہے نا کہ اس کے بعد۔ (طبی اخلاقیات، ص ۱۹، ناشر اسلامک فقہ اکیڈمی)

۳۔ مصنوعی بار آوری اور ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت طب جدید نے ایک خطرناک ایجاد مصنوعی بار آوری یا ٹیوب بے بی کے نام سے کی ہے جو شرعی اعتبار سے انتہائی حساس نوعیت کا معاملہ اور مختلف گوشوں کو حاوی ہے، جس سے خاندانی، سماجی و اخلاقی طور پر سنگین حالات مرتب ہوتے ہیں، اس کے مختلف طریقے آج مختلف مغربی ممالک میں رائج ہیں اور ان سے شرعی نقطۂ نظر سے بہت سے مسایل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن میں نسب و حرمت، مصاہرت، فراش زوجیت، غیر مرد کے ساتھ حاملہ عورت کا تعلق، عورت اور استبرائے رحم کے احکام شامل ہیں، ان کے علاوہ عورت کے اندر داخلی بار آوری یا نلکی کے اندر خارجی بار آوری کے بعد رحم میں انجکٹ کرنے کی ناجائز صورتوں کے ارتکاب پر وجوب حد کی سزا وغیرہ کے سارے ابواب ایک ساتھ کھل جاتے ہیں، رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی نے اس پر دو سمینار کرائے، ایک ۱۱ تا ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ اور دوسرا آٹھواں سمینار ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ میں منعقد کیا، ان میں اصل مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ اولاد حاصل کرنے کے لیے بار آوری (یعنی مرد و عورت کے درمیان براہ راست جنسی تعلق کے بغیر غیر فطری طریقے) کے درج ذیل دو بنیادی طریقے ہیں:

۱- **اندرونی بار آوری کا طریقہ:** یعنی مرد کے نطفہ کو عورت کے اندر مناسب مقام پر انجکٹ کر دیا جائے۔

۲- **بیرونی بار آوری کا طریقہ:** یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے انڈے کو ایک ٹسٹ ٹیوب میں رکھ کر طبی لیبارٹری میں بار آوری کی جائے پھر اس بار آور انڈے کو عورت کے رحم میں ڈال دیا جائے۔

ان دونوں ہی طریقوں میں عورت کی بے پردگی اس کام کو انجام دینے والے کے سامنے لازمی ہے، اس پر مزید بحث و مباحثہ سے یہ بات سامنے آئی کہ حمل و تولید کی غرض سے اندرونی یا بیرونی بار آوری کے لیے اپنائے جانے والے طریقے مختلف صورت میں سات ہیں، ان میں دو کا تعلق اندرونی بار آوری سے ہے اور پانچ کا بیرونی بار آوری سے ہے، داخلی بار آوری کے طریقے یہ ہیں

۱- ایک شادی شدہ مرد کا نطفہ لے کر اس کی زوجہ کی رحم میں مناسب مقام پر انجکٹ کر دیا جائے جہاں نطفہ فطری طریقے پر اس انڈے کے ساتھ مل جائے جو بیوی کی انڈا دانی خارج کرتی ہے، اس طرح دونوں میں بارآوری ہو پھر باذن اللہ رحم کی دیوار میں وہ چمٹ جائیں، جس طرح مباشرت کی صورت میں ہوتا ہے، اس طریقے کو اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مرد کے اندر کوئی ایسی کمی ہو کہ وہ اپنا مادہ منویہ دوران مباشرت عورت کے مناسب مقام تک نہ پہنچا سکے۔

۲- ایک شخص کا نطفہ لے کر دوسرے شخص کی بیوی کے اندر مناسب مقام پر انجکٹ کر دیا جائے جہاں اندرونی طور پر بارآوری ہو پھر رحم میں علوق ہو جائے، اس طریقہ کو اس وقت اپنایا جاتا ہے جب شوہر بانجھ ہو اور اس کے مادۂ منویہ میں انڈے نہ ہوں تو دوسرے مرد سے نطفہ حاصل کیا جاتا ہے۔

بیرونی بارآوری کے لیے یہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں:

۱- شوہر کا نطفہ اور اس کی زوجہ کا انڈا لے کر مقررہ فزیکلی شرایط کے مطابق ایک طبی ٹسٹ ٹیوب میں رکھا جائے، جہاں ان دونوں میں بارآوری ہو پھر جب بارآور حصہ بکھرنے اور تقسیم ہونے لگے تو مناسب وقت میں اسے ٹسٹ ٹیوب سے نکال کر اس خاتون کے رحم میں ڈال دیا جائے جہاں وہ ایک عام جنین کی طرح افزائش و تخلیق کے مراحل سے گزرے اور مدت حمل کی تکمیل کے بعد بچہ یا بچی کی پیدائش ہو۔ یہی بے بی ٹسٹ ٹیوب جدید طبی و سائنسی کارنامہ ہے جسے اللہ نے آسان فرما دیا ہے، اس طریقے سے بچے اور بچیاں پیدا ہو چکی ہیں جن کی خبریں اخباروں میں آتی رہی ہیں، اس طریقہ کو اس وقت اپنایا جاتا ہے جب بیوی بانجھ ہو اور اس کی وہ ٹیوب بند ہو جو اس کی انڈا دانی اور رحم کے درمیان جڑی ہوتی ہے۔ (فلوپین ٹیوب)

۲- شوہر کا نطفہ اور کسی غیر عورت کی رضامندی سے اس کے انڈے کو لے کر ٹسٹ ٹیوب کے اندر بیرونی بارآوری کی جائے پھر بارآور ہونے کے بعد اسے اس کی بیوی کے رحم میں ڈال دیا جائے، یہ طریقہ اس وقت اپنایا جاتا ہے جب اس کی بیوی کی انڈا دانی موجود نہ ہو لیکن رحم درست ہو۔

۳- ایک مرد کا نطفہ ایک غیر عورت کا انڈا (رضاکارانہ) لے کر ٹسٹ ٹیوب میں بیرونی بارآوری کے لیے رکھا جائے پھر اس حصہ کو کسی دوسری شادی شدہ عورت کے رحم میں ڈال دیا جائے، یہ طریقہ اس وقت اپنایا جاتا ہے جب شادی شدہ عورت جس کے اندر بارآور حصہ ڈالا گیا ہے لیکن اس کی انڈا دانی بانجھ ہو اور بچہ دانی درست ہو اور اس عورت کا شوہر بھی بانجھ ہو لیکن دونوں اولاد کی خواہش رکھتے ہوں۔

۴- ٹسٹ ٹیوب کے اندر بیرونی بارآوری زوجین کے انڈوں سے کی جائے پھر اسے حمل کے لیے رضامند عورت کے رحم میں ڈال دیا جائے، اس طریقے کو ایسے موقع پر اپنایا جاتا ہے جب زوجہ کا رحم کسی وجہ سے حمل کے قابل نہ ہو لیکن اس کی انڈا دانی درست ہو یا وہ از راہ فیشن حمل کے لیے تیار نہ ہوں اور دوسری رضامند عورت حمل کا بار اٹھائے۔

۵- یہ طریقہ بھی سابقہ طریقہ کی طرح ہے لیکن اس میں اتنا فرق ہے کہ بارآوری کے بعد اسے نطفہ والے مرد کی دوسری زوجہ کے اندر داخل کر دیا جائے جو اپنی سوکن کے بچے کے لیے رضامندی سے حمل کے لیے تیار ہو، یہ آخری طریقہ ان بیرونی ممالک میں جاری نہیں ہے جہاں تعدد ازدواج ممنوع ہے، بلکہ یہ صرف انہیں ممالک میں جاری ہے جہاں تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔

یہ طریقے یورپ و امریکہ میں یا تو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں یا انہیں "نوع بشری کی خوبصورتی" کا نام دیا گیا ہے اور کچھ ممتا کے تقاضے سے اپنائے جاتے ہیں کیوں کہ غیر شادی شدہ خواتین یا ان شادی شدہ خواتین میں بھی اس کا داعیہ ہوتا ہے جو خود اپنے یا شوہر کے کسی سبب کی وجہ سے حاملہ نہیں ہو پاتی ہیں، ان اغراض کے لیے انسانی نطفوں کے بنک بھی قایم ہو چکے ہیں، جہاں ان کو ٹیکنیکل طریقے پر طویل مدت تک محفوظ رکھا جاتا ہے جو رضاکارانہ یا بالعوض حاصل کیے جاتے ہیں، رابطہ کی فقہ اکیڈمی نے مذکورہ صورتوں کی روشنی میں شرعی اعتبار سے اس کے یہ عمومی احکام بتائے ہیں:

(الف) مسلمان خاتون کی بے پردگی غیر محرم کے سامنے شرعاً کسی حال میں بھی درست نہیں، الا یہ کہ کوئی ایسی صورت ہو جسے شریعت نے بے پردگی کے لیے وجہ جواز تسلیم کیا ہو۔

(ب) گو خواتین کے لیے مرض کے علاج کے سلسلے میں کشف عورت جائز ہے مگر بقدر ضرورت ہی کشف ستر گنجایش ہے۔

یہ تو عام حکم تھا مگر مصنوعی بارآوری کے مذکورہ تینوں جائز طریقوں میں اکیڈمی نے

گیا ہے کہ نومولود کا نسب و نطفہ انڈا دینے والے زوجین سے ثابت ہوگا، میراث اور دیگر حقوق ثبوت نسب کے تابع ہوتے ہیں، لہٰذا بچہ کا نسب جس مرد و عورت سے ثابت ہوگا، وراثت اور دیگر احکام بھی ان ہی کے درمیان ثابت ہوں گے۔

سوکن کی طرف سے حمل کے لیے رضا کارانہ تیار ہونے والی زوجہ (جو ساتویں طریقہ میں مذکور ہے) بچہ کی رضاعی ماں ہوگی، کیوں کہ بچہ نے اس کے جسم و عضو سے استفادہ اس سے کہیں زیادہ کیا ہے جتنا کہ ایک شیرخوار بچہ مدت رضاعت کے اندر دودھ پلانے والی عورت سے کرتا ہے۔

مذکورہ صدر خارجی و داخلی بار آوری کے طریقوں میں سے بقیہ چاروں طریقے شرعاً حرام ہیں، ان میں جواز کی کوئی گنجایش نہیں ہے، کیوں کہ ان میں یا تو نطفہ اور انڈا زوجین کے نہیں ہیں یا رحم کرایہ کی عورت نطفہ اور انڈا والے زوجین کے لیے اجنبی ہے، اس لیے اکیڈمی دینی جذبہ رکھنے والوں کو نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کریں، الا یہ کہ انتہائی سخت ضرورت ہو اور ضرورت شدیدہ کے تعین میں بھی پوری احتیاط مدنظر رکھی جائے۔

اکیڈمی کے سابق صدر شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے مذکورہ تینوں حالتوں میں توقف اختیار کیا ہے، اس لیے جواز خطرے سے خالی نہیں، شیخ محمد بن عبداللہ السبیل امام حرم مکی نے دوسری اور تیسری حالت میں توقف کیا ہے۔

۴۔ لاش کا پوسٹ مارٹم جدید طبی ایجادات میں انسانی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہے جس کے احترام کا حکم اسلام نے دیا ہے اور پوسٹ مارٹم میں اعضا کاٹے اور توڑے جاتے ہیں جن سے اس کی بے حرمتی ہوتی ہے، اس سلسلے میں آنحضورؐ کا ارشاد ہے "کسر عظم المیت ککسرہ حیا" (رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ، کتاب الجنائز) "مومن مُردوں کی ہڈی توڑنا اتنا ہی بڑا جرم ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کا احترام مرنے کے بعد بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح اس کی زندگی میں تھا اور پوسٹ مارٹم سے انسانی لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے تاہم یہ ایک اہم دینی ضرورت ہے، اس بنا پر رابطہ کی فقہ اکیڈمی نے اپنے دسویں سمینار منعقدہ ۲۴ تا ۲۸ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں درج ذیل امور طے کیے ہیں:

اول: مندرجہ ذیل مقاصد کے تحت لاشوں کا پوسٹ مارٹم جائز ہے۔

(الف) تعزیراتی مقدمے میں موت یا جرم کے اسباب کی دریافت قاضی کے لیے دشوار ہو اور پوسٹ مارٹم کے بغیر اس کی دریافت ممکن نہ ہو۔

(ب) پوسٹ مارٹم کے متقاضی امراض کی دریافت مطلوب ہو، تا کہ اس کی روشنی میں ان امراض سے متاثر لوگوں کا مناسب اور ضروری علاج کیا جاسکے۔

(ج) پوسٹ مارٹم کے ذریعہ طب کی تعلیم و تدریس مقصود ہو جیسا کہ میڈیکل کالجز میں رائج ہے۔

دوم: بہ غرض تعلیم پوسٹ مارٹم میں درج ذیل شرایط کی رعایت ضروری ہے:

(الف) لاش اگر کسی معلوم شخص کی ہو تو موت سے قبل خود اس کی یا موت کے بعد اس کے وارثین کی اجازت ضروری ہے، معصوم الدم لاش کا پوسٹ مارٹم بغیر اجازت نہیں کرنا چاہیے۔

(ب) پوسٹ مارٹم بہ قدر ضرورت ہی کیا جائے تاکہ لاشوں کی زیادہ بے حرمتی سے بچا جاسکے۔

(ج) خواتین کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم خواتین ڈاکٹروں کے ذریعہ ہی کرنا ضروری ہے۔

سوم: تمام حالتوں میں پوسٹ مارٹم شدہ لاش کی تدفین شرعاً واجب ہے۔

شیخ صالح بن فوزان کو طبی تعلیم کی غرض سے بھی مسلم لاش کے پوسٹ مارٹم کے جواز سے اتفاق نہیں اور شیخ محمد بن عبداللہ السبیل حفظہ اللہ نے اس بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔

بعض دیگر ارکان بھی تعلیم و امراض کی تحقیق کے لیے مسلم لاش کے پوسٹ مارٹم کے جواز کے حق میں نہیں ہیں۔ (دیکھیے: فقہی فیصلے، اردو فقہ اکیڈمی مکہ، ص:۱۸۴)

۵۔ تعدیہ (انفکشن) اور اسلام جدید طب میں انفکشن (Infection) کا شمار دور حاضر کی سنگین بیماریوں میں ہوتا ہے جس سے بچاؤ کے لیے قومی سرمایہ کا اچھا خاصا پیسا خرچ ہوتا ہے، اس کے باوجود حفظان صحت کے تعلق سے انفکشن کا مسئلہ دنیا کے لیے ایک ناقابل تسخیر چیلنج بنا ہوا ہے اور تمام بنی نوع کے لیے مہلک صورت حال پیدا کر رہا ہے، انفکشن کی تعریف طب جدید میں یہ کی گئی ہے کہ کسی مرض کے مادے (جراثیم) کا کسی ذی حیات کے جسم میں داخل ہو کر ترقی و افزایش نسل کرنا نیز جسم میں اس کے خلاف مدافعانہ ردعمل کا پیدا ہونا۔ (Text book of Preventive & social medicine By: J.E. Park, P.18)

مگر عموماً انفکشن اسی مرض کو کہا جاتا ہے جو کہ ہوا، پانی، غذا اور دیگر ذرائع سے ایک شخص سے دوسرے شخص کو لگ جاتا ہے اور اس طرح سے اس کا سلسلہ بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات وہ وبائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

طب جدید میں سب سے پہلے (Fracastoiurs) نے (Theory of Contagion) (چھوت) کا خیال ظاہر کیا جو بعد میں نظریہ تعدیہ کی بنیاد بنا مگر سچی بات یہ ہے کہ Germ Theory کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال قبل پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے تعدیہ کا تصور نہ صرف پیش کیا بلکہ اس سے تعلق سے ایسی ہدایات اور حفاظتی تدابیر دنیا کے سامنے پیش کیں جن کو (Priventive & social medicine) تحفظاتی تدابیر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

دراصل گزشتہ صدیوں میں مغرب نے حیرت انگیز علمی ترقی کی ہے مگر اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ مغرب نے مسلمانوں ہی کی علمی کاوشوں سے خوشہ چینی کی ہے، طب کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح ہدایات موجود ہیں، تعدیہ کا نظریہ نبیؐ کی اس حدیث میں ملتا ہے "لا یوردنّ ممرض علی مصح" (بخاری کتاب الطب) (جس کے اونٹ بیمار ہوں وہ ان کو پانی پلانے کے لیے اس گھاٹ پر ہرگز نہ لے جائیں جہاں کسی کے تندرست اونٹ پانی پیتے ہوں) جب جانوروں کے معاملے میں اس نظریے کو مدنظر رکھا گیا ہے تو انسانوں کے معاملے میں اس کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ (ملخص مجلہ الفرقان، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء)

اسی طرح جذام بھی ایک خطرناک متعدی مرض ہے، طب جدید میں اس کے لیے (Leprosy) کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے، اس کے لیے ایک مخصوص جرثومہ کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے جس کی تحقیق ۱۸۷۳ء میں (Hansen) نامی سائنس داں نے کی، اس کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "فر من المجذوم کما تفر من الأسد" (بخاری، کتاب الطب، باب الجذام) (جذامی سے ایسے بھاگو جیسے کہ شیر سے بھاگتے ہو)، ان احادیث سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ تعدیہ کا تصور آج سے چودہ سو برس قبل اسلام میں نہ صرف موجود تھا بلکہ اس کے خطرات و مضرات کا بھی پوری طرح احساس تھا۔ (حوالہ مذکور)

۶۔ کلوننگ (Cloning) کی شرعی حیثیت کلوننگ ایک جدید طبی و سائنسی تحقیق ہے جس کا وجود

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا ہے اور یہ مسئلہ ۱۹۹۷ء میں اس وقت عالمی طور پر ابھرا، جب اسکاٹ لینڈ کے کچھ سائنس دانوں نے ایک "بھیڑ ڈولی" کو اسی طریقہ کلوننگ کے ذریعہ پیدا کی، جس پر پوری دنیا حیرت زدہ رہ گئی کلوننگ انگریزی لفظ ہے، اس کی اصل یونانی لفظ کلون (Klon) ہے جس کے لفظی معنی شاخ یا نوزائیدہ یا قلم کاپی کرنے کے ہیں، عربی میں اسے "استنساخ" کہتے ہیں، جس طرح درختوں یا نباتات میں ایک درخت کی شاخ کاٹ کر دوسرے درخت کی شاخ میں جوڑا جاتا ہے اور اس سے ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے اسے کلوننگ کہتے ہیں جس کی تکنیک بہت پرانی ہے یعنی دو پودوں کو ملا کر تیسرا پودا حاصل کیا جائے، بیسویں صدی کے نصف آخر سے اس عمل کا تجربہ جانوروں میں کیا گیا، ۱۹۵۱ء میں دو امریکی سائنس داں رابرٹ برگس اور تھامس کنگ نے ایک مینڈک تیار کیا، ۱۹۹۳ء میں انسانی کلوننگ کی بھی کوشش کی گئی پھر مارچ ۱۹۹۷ء میں امریکہ کی ایک یونی ورسٹی اوری گون میں دو بندر کلوننگ کے ذریعہ پیدا کیے گئے، اس کے لیے مختلف طریقے اپنائے گئے، جیسے:

۱۔ سب سے پہلے مونث کا انڈا ضروری ہے، اس لیے کہ صرف جنسی خلیہ میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے خلیہ کے ساتھ آ کر مل جائے اور تقسیم کا عمل شروع کر دے، جسم کے دوسرے حصہ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

۲۔ ۴۶ کروموزوم کی موجودگی لازمی ہے خواہ مذکر و مونث کے جنسی خلیوں سے ۲۳+۲۳ ملا کر ۴۶ ہوں۔

۳۔ بارآوری کے بعد رحم میں ڈالنا ضروری ہے جہاں طبعی طریقے پر مدت پوری ہونے کے بعد ولادت ہوتی ہے، حالاں کہ اللہ رب العالمین کا اعلان ہے "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" (سورۂ زمر: ۶۲) "اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (الاعراف ۵۴) "لَن یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ" (حج: ۷۳)۔

اس لیے کلوننگ کے اس عمل کو نہ تو تخلیق کہا جا سکتا ہے نہ ہی خلق میں شرکت۔ مسلم کا عقیدہ اپنی جگہ قایم ہے البتہ اس کے منفی اثرات زندگی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھتے ہیں جس پر عمل درآمد کے بعد انسانی دنیا میں بہت نازک مسایل اقدار کے بارے میں پیدا ہوں گے، ذرائع ابلاغ میں

اس کے متعلق جس طرح کی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے تخلیق پر قدرت پالی ہے جب کہ ایک مسلمان کا واضح عقیدہ ہے کہ تخلیق پر قادر صرف اللہ ہی ہے جس کا اعلان خود اس نے یوں کیا ہے کہ ''أأنتم تخلقونه أم نحن الخالقون'' (کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں) صفت خلق میں شرکت سے شرک کا گمان پیدا ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ سائنس صرف موجد ہے خالق نہیں ہے، یعنی وہ کسی راز سے صرف پردہ اٹھاتی ہے، اسی طرح اللہ کا یہ اعلان کہ ''علم الانسان مالم یعلم''۔ (سورۂ علق:۵)

دوسری طرف اللہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ ''وما أوتيتم من العلم الا قليلا'' (یعنی تمہیں جو علم ملا ہے وہ بہت کم ہے) اس موقع پر اس بات کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' میں جہاں علم کیمیا پر بحث کی ہے وہاں انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ پیدایش کا جو فطری طریقہ ہے کیا رحم مادر سے باہر بھی کسی حیوان کا وجود ممکن ہے، یہ عجیب بحث علامہ ابن خلدون نے کی ہے جو قدیم علما میں ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ مرد کے مادہ منویہ اور عورت کے رحم میں موجود بیضا کا باہم امتزاج اور پھر ان کو ایک مخصوص ماحول جو رحم مادر میں میسر ہے فراہم کردیا جائے یعنی اگر وہی درجہ حرارت اور وہی پورا معتدل ماحول جو رحم کا ہے خارج رحم میں پیدا کیا جاسکے تو غیر عادی طریقہ سے ماں کے رحم کے باہر بھی تخلیق وجود میں آسکتی ہے چوں کہ عملی سائنس اس وقت بہت کم تھی، نظریاتی تحقیق زیادہ تھی، آگے لکھتے ہیں کہ ایسا کرنا دشوار اور مشکل ہے لیکن بنیادی طور پر اس امکان کو انہوں نے خارج نہیں کیا ہے جس کے نتیجہ میں نسل خیز سے بنی اور ترقی کرتے کرتے دنیا آج کلوننگ تک پہنچ گئی ہے، فطرت الٰہی یہ ہے کہ سبب اور مسبب کو مربوط کرتا ہے سائنس اسی رشتے کی تحقیق ہے مگر نتیجہ معلوم ہے۔ (جدید سائنسی تکنیک کلوننگ ص ۱۰۹)

کلوننگ سے پیدا ہونے والے خطرات یوں تو ہر دن کا سورج اپنے ساتھ کچھ نئی چیزیں لے کر طلوع ہوتا ہے لیکن ۱۹۹۷ء میں اس کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہونے والی ''ڈولی بھیڑ'' نے عالم وجود میں ایک ہلچل مچادی تھی، اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس دان ویلمٹ نے ایک چھ سالہ مادہ بھیڑ کے تھن سے نکالے گئے ایک خلیہ (cell) کو دوسری مادہ بھیڑ کے جنسی انڈے میں بارآور کرنے اور پھر اسے تیسری بھیڑ کے رحم میں ڈالنے کے بعد جب ڈولی نامی بھیڑ پیدا ہوئی تو اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے ڈاکٹر ویلمٹ اور ان کی ٹیم نے دعوی کیا کہ اسی عمل اور تکنیک کو اپنا کر انسان بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے نئے پیدا ہونے والے انسان کا حسب نسب کیا ہوگا، وہ کس کا بیٹا ہوگا اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ اس سے بہت سے شرعی و سماجی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے، (جدید سائنسی تکنیک کلوننگ ص ۹۷-۱۰۲) بنابریں نہ صرف مذہبی رہنما بلکہ سائنس داں بھی تکنیکی پہلوؤں کے سبب اور اخلاقی بنیادوں سے بہت زیادہ فکر مند ہیں کیوں کہ یہ سائنسی ایجاد کسی مذہب کے لیے نہیں بلکہ سماجی طور پر دنیا کے لیے ایک خطرہ بن جائے گی، اسی لیے علما اس کو نہ صرف حرام قرار دیتے ہیں بلکہ ممکن بھی نہیں مانتے ہیں اور اگر کوئی ممکن مان بھی لے تو وہ ایسا انسان نہیں ہوگا جو عام انسانوں جیسا اور ان کی شکل و ہیئت کا ہو دراصل کلوننگ فطری نظام سے متصادم ہے اور انسانی کلوننگ کے نتیجے میں انسانی معاشرہ پر جو خطرناک اثرات مرتب ہوں گے، اس کا اندازہ کرلینے کے سبب اکثر ترقی یافتہ ممالک نے اپنے یہاں انسانی کلوننگ پر قبل از وقت پابندی عاید کردی تھی، اس لیے کلوننگ میں فواید سے کہیں زیادہ نقصانات مضمر ہیں، یہاں کلوننگ کے موجد ڈاکٹر ویلمٹ کی بات نقل کردینا مناسب ہے، موصوف نے ۱۲/ مارچ ۱۹۹۲ء کو واشنگٹن میں ایک پریس کانفرنس میں اقرار کیا کہ انسانی کلوننگ تیار کرنے میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ مسخ لوگوں کی نسل بھی تیار ہوجائے گی اور یہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لیے گناہ ہوگا، دہلی میں واقع Intemation center for genetic engineering (I.C.G.E) کے ڈاکٹر تلوار کے مطابق کلوننگ میں کامیابی کا فیصد بہت کم ہے، اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر ویلمٹ اور ان کی ٹیم نے 277 خلیوں پر اپنے تجربات کیے تھے جس میں سے صرف ایک ہی کامیاب ہوا اور وہ ڈولی نام کی بھیڑ تھی جو عام قسم کے بھیڑ سے مختلف تھی اور جس پر 75 ہزار امریکی ڈالر صرف ہوا تھا اور فائنس دوا کی برطانوی کمپنی PPL نے کیا تھا، وہ تقریباً مردہ سی تھی بے حد کمزور اور بیمار اور کچھ ہی دنوں میں گٹھیا کے مرض میں دم توڑ دیا (روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو، دہلی، امنگ: ۔۔۔ جنوری ۲۰۰۳ء) اور جب بھیڑ کی کلوننگ کامیاب نہ ہوسکی تو انسان کا

تجربہ کیسے کامیاب ہوگا، کلوننگ پر عقیدہ رکھنے والے لوگ یہ کیسے بھول جاتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو ایک یا دو قطرے سے پیدا کیا، جس کو دنیا ہزاروں سال سے جانتی ہے اگر واقعی سائنس داں اور اطبا کوئی کارنامہ انجام دینا چاہتے ہیں تو بھیڑ سے انسان پیدا کردیں یا لوہے سے کوٹ کر انسان بنائیں جو انسان ہی کی طرح چلے پھرے لیکن ایسا اب تک عمل میں نہیں آیا ہے اور نہ ہی اس کا امکان ہے۔

ذرائع ابلاغ نے یہ خبر دی کہ حوا نامی بچی کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہوئی لیکن وہ بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکی، سائنس میں اس کی پیدائش کے موضوع کو لے کر سرد بحث جاری ہے کچھ کا کہنا ہے کہ حوا ایک حقیقت ہے تو آنے والے دنوں میں اس کے برے نتائج برآمد ہوں گے، ان کے کہنے کے مطابق حوا وقت سے پہلے سن شباب کو پہنچ جائے گی کیوں کہ پیدا ہوتے وقت اس کی عمر 21 سال تھا، کچھ کا کہنا ہے کہ ''ڈولی'' کی طرح حوا پر بھی وقت بے رحمی سے اثر دکھائے گا، اگر وہ کلوننگ ہے تو نہ صرف اس کی زندگی کم ہوگی بلکہ وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہوجائے گی۔ (ماہنامہ رفیق منزل، دہلی، فروری ۲۰۰۳ء)

اس طرح کلوننگ کائنات سے مختلف رنگ و روپ کو مٹا دینا چاہتی ہے، رب کائنات نے تو انسانوں کو مختلف رنگ و روپ میں پیدا کیا ہے لیکن سائنس داں انہیں ایک ہی انداز و ہیئت میں ڈھالنے کے دعوے دار ہیں، جس کے سبب انسانی زندگی اور اجتماعی و انفرادی معاملات میں مفاسد کا پیدا ہونا یقینی ہے، چنانچہ اگر ایک عورت کے شوہر کا دوسرا کوئی ہم شکل مرد ایک ہی جگہ موجود ہو تو وہ اپنا شوہر کس کو تسلیم کرے گی، غرض کلوننگ سے پیدا ہونے والی دشواریاں اور پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی گنجایش نہیں، یہاں چند مفاسد اور خطرات کا ذکر اجمالاً کیا جاتا ہے:

۱- اس طریقے کی بیشتر پیدایش میں نقص ہوگا، بسا اوقات سارے ناقص الخلقت ہوں گے۔

۲- رشتے اور خاندان کا نظام تہ و بالا اور ٹوٹ پھوٹ جائے گا جس سے قرابت، میراث اور نسب کی دشواریاں جنم لیں گی۔

۳- پیدا ہونے والا بچہ والدین اور ان کی شفقت سے محروم رہے گا اور مستقل نفسیاتی مشکلات سے دوچار رہے گا۔

۴- جس کے خلیہ سے بچے کی نقل تیار ہوگی، اس کا وہ لڑکا ہوگا یا بھائی یا جس کے بطن سے

جنم لے گا وہ عورت اس کی کیا ہوگی؟

۵- بڑے بڑے جرایم پیشہ افراد جنم لے کر دنیا میں تہلکہ مچا دیں گے۔

۶- دوسرے ظالم و مجرم کی موت سے انسانیت کو نجات نہیں ملے گی۔

۷- پیدا ہونے والے کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟

کلوننگ اور شرعی نقطۂ نظر

اسلام ہر چیز میں اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھتا ہے، چنانچہ جو چیز حرام ہے اس سے وہ مکمل طور سے بچنے کی تاکید کرتا ہے، اگر حلت و حرمت واضح نہ ہو تو اس سے بھی احتیاط ضروری ہے، حضرت نعمان بن بشیرؓ کی متفق علیہ روایت ہے ''الحلال بین والحرام بین و بینهما المشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات فقد استبرأ لدینه'' (متفق علیہ) اس لیے علمائے اسلام اس باب میں نہایت متردد ہیں، اس موضوع پر طبی تنظیم کویت اور فقہ اکیڈمی جدہ نے مراکش میں مشترکہ سمینار کیا، جس میں یہ فیصلہ کیا کہ مرد و عورت کے ازدواجی تعلق کے اندر کسی بھی تیسرے فریق کی شمولیت بہرصورت حرام ہے، خواہ مادۂ منویہ کی شکل میں ہو، خواہ انڈا یا رحم کی شکل میں ہو۔

کلوننگ کا مسئلہ شریعت کی نگاہ میں متعدد وجوہ سے قابل اعتراض ہے اور یہ بات واضح ہے کہ دین و اخلاق سے بے پروا ہو کر محض سائنس و تحقیق کی بنا پر جو نتائج ظہور پذیر ہوں گے، وہ دین کی بنیادوں پر فٹ نہیں ہوسکیں گے، جس طرح ایٹمی ایجاد سے دنیائے انسانیت تباہ و برباد ہے اسی طرح سائنسی تحقیق سے ازدواجی تعلقات کا احترام ختم ہو کر ناجائز جنسی تعلق کا دروازہ کھل جائے گا جو اسلام کی نظر میں صریحاً حرام ہے، کلوننگ میں جہاں یہ اصول ٹوٹ کر رہ جاتا ہے وہیں خاندانی رشتہ و قرابت کا نظام بھی درہم برہم ہوجاتا ہے، ان ہی امور کے پیش نظر علمائے دین نے کلوننگ کی مکمل نفی و تردید کی ہے، معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے تین بنیادوں پر کلوننگ کو حرام قرار دیا ہے:

۱- پہلی بنیاد یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں میں امتیاز و فرق رکھا ہے ''وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ'' (فاطر: ۲۷) یہ امتیاز کلوننگ میں ختم ہوجاتا ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ''وَ

خلقناکم ازواجا "۔(النبا:۸)

۳- تیسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرہ میں اس خاندان کو معیار و بنیاد بنایا ہے، جس کے زیر سایہ بچہ پرورش پاتا ہے اور یہ خاندانی نظام کلوننگ میں فنا ہو جاتا ہے۔

تصویر کا دوسرا پہلو: فقہی و شرعی نقطہ نظر سے قطع نظر اس کا دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے کہ کلوننگ کی مخالفت کے باوجود ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ اسلام میں ایسی کسی تحقیق کی ہمت افزائی سرے سے ممنوع نہیں ہے، مدرسہ ہو یا منبر، مسجد ہو یا مندر، چرچ ہو یا کلیسا یا سیاسی تنظیمیں، یہ سب وقتی و ذاتی مفاد کی خاطر چیخ پڑتے ہیں، انسان نے چاند پر قدم رکھا تو یہ چیخے، ضبط تولید اور اعضاء کی پیوند کاری کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے، غرض ہر نئی چیز پر ہنگامہ برپا کرنا ان کا شیوہ ہے، ٹیوب بے بی کو بھی حرام قرار دیا تاہم بہت سی نئی ایجادات پر یہ زیادہ برہم نہیں ہوئے مثلاً جہاز کا ہواؤں میں اڑنا اور خلاؤں کی تسخیر، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ، گو فطرت کے مظاہر نہیں لیکن دینی طبقہ ان کے خلاف اس قدر شدت سے صف آرا نہیں ہوا جتنا کلوننگ کے خلاف ہے۔

ہمارے خیال میں کلوننگ کے مخالفین کی یہ دلیلیں بجا ہیں:

۱- انسانی کلوننگ سے انسان کی عزت و شرف کو بٹہ لگتا ہے اور اس کی توہین ہوتی ہے۔

۲- کلوننگ سے انسان پیدا کرنا فطری اصول و افزائش کے خلاف اور کھلم کھلا اللہ سے بغاوت ہے۔

۳- کلون شدہ افراد سماج میں احساس کمتری کے شکار رہیں گے، ان کے حقیقی ماں باپ کا پتہ نہیں رہے گا۔

۴- کلوننگ کو مفاد پرست عناصر اپنے غلط مقاصد کے استعمال کا ذریعہ بنائیں گے۔

۵- اس سے سماج میں عدم مساوات کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی نے کلوننگ کو سرے سے حرام قرار دیا ہے اور اس پر مکمل پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔ (فقہی فیصلے: رابطہ عالم اسلامی، مکہ)

۲- ضبط ولادت یا منع حمل کا شرعی حکم

ضبط ولادت یا انگریزی میں (faimly planning) یا (birth control) کی [illegible] اور زور و شور سے اہل مغرب یہ کہہ کر اشاعت کرتے ہیں کہ اس

سے انسان پر بچوں کی پیدائش کا بوجھ کم پڑے گا، کثرت پیدائش کم کرنے یا بچے کے عالم وجود میں آنے سے پہلے اس کو روک دینے کے لیے مختلف دوائیں، انجکشن یا نرودھ، کنڈوم یا آپریشن اور مختلف خارجی تدبیریں ایجاد کرلی گئی ہیں اور ان کی پوری تشہیر کی جارہی ہے۔

دور نبویؐ میں یعنی صدر اسلام میں منع حمل کا سب سے معروف طریقہ "عزل" کا تھا، صحیح بخاری میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے "کنا نعزل والقرآن ینزل" (ہم عزل کرتے تھے جب کہ قرآن کا نزول جاری تھا) اس کے علاوہ اور بھی بعض روایتوں سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے (بخاری کتاب النکاح، باب العزل) اس کے مقابلے میں دوسری احادیث سے اس فعل کی حرمت و ممانعت ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ عزل کے متعلق آپؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا "یہ چھوٹے پیمانے پر زندہ درگور کرنے کے برابر ہے" علامہ ابن تیمیہؒ سے بھی منع حمل سے متعلق فتویٰ دریافت کیا گیا تو فرمایا "اما جواز ذلک ففیہ نزاع بین العلماء والاحوط انہ لا یفعل واللہ اعلم"، (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۳/۲۷۱) عزل کے جواز میں علما کے مابین اختلاف ہے محتاط طریقہ یہ ہے کہ نہ کیا جائے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اس کی تحریک زور پکڑ چکی تھی، سب سے پہلے یہ نعرہ (T.R.Malthus) ٹی- آر- میلتھس نے لگایا کہ روئے زمین پر سکونت و معیشت کے وسایل بہت محدود ہیں، جب کہ نسل انسانی کی افزائش لامحدود ہے، اگر اضافے کا یہ تسلسل جاری رہا تو چند برسوں میں زمین تنگ ہوجائے گی اور فقر و محتاجی بڑھ جائے گی، اس لیے نسبندی ضروری ہے، پھر انیسویں صدی کے اخیر میں یہ تحریک جرمنی و فرانس پہنچی اور وہاں سے لندن ہوتے ہندوستان پہنچی، اس کے بعد دن بہ دن اس کا زور بڑھتا گیا، عموماً کسی تحریک کی کامیابی کے لیے کچھ جھوٹے اور دل فریب نعرے گڑھے جاتے ہیں، اس کے لیے بھی اقتصادی بہتری اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا نعرہ ایجاد ہوا، جب کہ ضبط تولید کا عمل طبی نقطہ نظر سے بہت سے جسمانی عوارض اور سماجی نقصانات کا باعث بنتا ہے، مردوں میں آتشک و سوزاک جیسے امراض خبیثہ کے ساتھ نامردی بھی آجاتی ہے اور عورتوں میں بقول ڈاکٹر میری اسکارلب (چالیس سالہ تجربہ) عصبی کمزوری، پژمردگی، شگفتگی کا فقدان، چڑچڑاپن، اشتعال انگیزی، بے خوابی، دوران خون کی کمی، ایام ماہواری کی بے قاعدگی جیسے مرض نیز جسم

لیتے ہیں جو نسل کشی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ اولاد جیسی نعمت سے انسان محروم ہو جاتا ہے، جو میاں بیوی کو آپس میں مل کر رہنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب اولاد نہ ہو تو مل کر رہنا مشکل ہو جاتا ہے، اس سے ازدواجی تعلقات سرد اور زنا کے دروازے کھل جاتے ہیں، جس سے معاشرہ اخلاقی انحطاط و زوال کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے برعکس اسلام نے افزائش نسل کی ترغیب دی ہے، اللہ کا فرمان ہے "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی و ثلث و ربع" (النساء ۳) اور حدیث شریف میں رسولؐ نے فرمایا "تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم" (سنن ابی داؤد و ابن ماجہ) (تم زیادہ محبت کرنے والی اور بچہ پیدا کرنے والی عورتوں سے شادی کرو تو میں تمہاری کثرت سے دوسری قوموں پر فخر کروں گا) ظاہر ہے برتھ کنٹرول یا ضبط ولادت سے یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے، جہاں تک خرچ و کفالت کے بوجھ کم کرنے کا مسئلہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمہ داری خود لے لی ہے اور فرمایا "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا و مستودعھا" (ہود ۶) روزی دینے کا وعدہ اللہ نے کیا ہے اور فرمایا "لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم و ایاکم" (بنی اسرائیل ۳۱) (مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے خالص نظام ربوبیت کے تحت پرورش اور رزق کو اپنی ذمہ داری قرار دیا ہے اور کسی کو اس میں مداخلت کا حکم نہیں دیا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ ضبط ولادت بغیر کسی عذر کے شرعی و اخلاقی، سماجی و جسمانی ہر اعتبار سے نہ صرف نقصان دہ ہے بلکہ فعل حرام ہے، جس کی تردید کتاب و سنت میں موجود ہے اور خود اہل مغرب کو جب لمبے تجربے کے بعد اس عظیم نقصان کا اندازہ ہوا تو ۱۹۰۶ء میں ایک نیشنل برتھ ریٹ مقرر کیا اور رپورٹ میں کہا کہ برطانیہ کو اپنی شرح پیدائش کی کمی پر سخت تشویش ہے، اس کو روکنے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے، اسی طرح فرانس نے ضبط ولادت کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور بچہ پیدا کرنے والے خاندانوں کو مالی امداد دی جانے لگی، ایک نازی لیڈر نے کہا کہ ہماری شرح پیدائش کی کمی سے خطرہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ہماری قوم بانجھ ہو جائے گی۔ (اسلام اور ضبط ولادت، ص: ۲۴)

یورپ کے ممالک میں خود [illegible] بچوں کو

قبل از ولادت خریدنے پر مجبور ہوتی تھی۔ یورپ والوں میں بچوں کا مستقل کاروبار شروع ہو گیا، (سہ روزہ دعوت دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء) اس سے معلوم ہوا کہ برتھ کنٹرول کے پیچھے مغربی ملکوں کا یہ جذبہ و مقصد بھی کارفرما تھا کہ اپنی تعداد بڑھا کر اور مسلمانوں کی تعداد کم کر کے ان کو اپنا غلام بنائیں۔

رابطہ کی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ رابطہ عالم اسلامی، مکہ کی فقہ اکیڈمی نے ضبط ولادت پر اپنا یہ فیصلہ صادر کیا، اسلامی شریعت نسل انسانی کے اضافے کی ترغیب دیتی ہے، اس کی بابت قرآن مجید و حدیث رسولؐ میں متعدد ہدایات دی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید یا منع حمل اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسانی کے خلاف اور شریعت اسلامی سے غیر ہم آہنگ ہے، برتھ کنٹرول یا منع حمل کے علم برداروں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان خاص کر عرب اقوام اور کمزور قبائل کی تعداد میں کمی لائیں تاکہ ان کے ممالک کو اپنی کالونی اور وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنا کر اسلامی ممالک کی نعمتوں اور قدرتی ذخایر سے فایدہ اٹھائیں، دوسری جانب یہ عمل اللہ تعالیٰ سے ایک طرح کی بدگمانی اور جاہلانہ فعل ہے، ان امور کے پیش نظر رابطہ نے اپنے مذکورہ فقہی اجلاس میں بالاتفاق طے کیا کہ برتھ کنٹرول یا ضبط تولید مطلق جایز نہیں اور فقر کے خوف سے بھی منع حمل جایز نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی رزق اور زبردست قوت کا مالک ہے، البتہ انفرادی طور پر اگر ضرر کا خطرہ ہو تو اس صورت میں جواز کی گنجایش ہو سکتی ہے، مثلاً کسی عورت کو معتاد طریقہ پر ولادت (Normal Delivery) نہیں ہو رہی ہے اور آپریشن ناگزیر ہو تو استقرار حمل کو روکنے یا اسے موخر کرنے والے اسباب اختیار کرنا جایز ہے، اسی طرح اگر قابل اعتماد مسلم ڈاکٹر کی رائے میں استقرار حمل کی صورت میں جان کو یقینی خطرہ لاحق ہو تو ایسی صورت میں منع حمل کی صورت اختیار کرنا ہی متعین ہو جاتا ہے۔ (ذمہ داران رابطہ کے دستخط، فقہی فیصلے: ۲۳ تا ۳۰ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ، ص: ۵۹، ناشر فقہ اکیڈمی ۲۰۰۱ء)

۸-اعضا کی پیوند کاری کسی ایک انسان کے بعض اعضا کو دوسرے ضرورت مند انسان کے اندر پیوند کر دینا بھی جدید طبی ایجاد اور اس کا بڑا کارنامہ ہے لیکن اس میں علما کا شدید اختلاف ہے کیونکہ کسی انسان کا عضو اس کے جسم سے علاحدہ کرنے کو مثلہ کہا جاتا ہے جو بالاتفاق حرام ہے، یہی علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی فتویٰ ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۸/۳۱۴)

رہا یہ مسئلہ کہ انسانی لاش سے انتفاع پیوند کاری کے لیے جایز ہے کہ نہیں تو اس کی جزئیات:

تفصیلات بہت زیادہ ہیں تاہم یہ بات مسلم ہے کہ انسان کا پورا جسم اللہ کی ایک امانت ہے جس کے متعلق وہ رب کے حضور جواب دہ ہے، اللہ کا ارشاد ہے " اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" (بنی اسرائیل ۳۶) بیشک کان اور آنکھ اور دل میں سے ہر ایک کے بارے میں پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔

مذکورہ چیزوں میں انسان اسی حد تک تصرف کرسکتا ہے جس حد تک شریعت نے اسے اجازت دی ہے، رہا انسان کی لاش سے انتفاع کا مسئلہ تو کتاب وسنت میں اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ملتی، انسان کی لاش کو احترام سے دفنانے کی ترغیب اسلام نے شروع ہی سے دی ہے، جب ہابیل کو قتل کرنے کے بعد قابیل کو دفنانے کا طریقہ معلوم نہ ہوا تو اللہ نے ایک کوا بھیجا جس کا ذکر قرآن میں یوں کیا " فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ" (المائدہ ۳۱) (اللہ تعالی نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھود رہا تھا تاکہ اسے دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپادے) اس سے انسانی لاش کا محترم ہونا بالکل واضح ہے، اگر انسانی اعضاء دل، گردہ، آنکھ وغیرہ کی فروخت ہونے لگے تو پھر انسان بکاؤ مال بن جائے گا جس میں انتفاع سے زیادہ مضرت کا پہلو غالب ہے۔

البتہ خون کی نوعیت دوسری ہے، یہ اضطراری حالت میں دینا جائز ہے، کیوں کہ خون کوئی انسانی عضو نہیں بلکہ وہ جسم میں پیدا ہوتا رہتا ہے جو نکالے ہوئے خون کی تلافی کردیتا ہے لیکن اعضائے انسانی آنکھ اور گردہ وغیرہ اگر نکال دیے جائیں تو نئی آنکھ یا نیا گردہ پیدا نہیں ہوتا۔ (جدید فقہی مباحث ص ۱۹۱-۱۹۵، مضمون شمس پیرزادہ، ممبئی)

۹۔ ایکسرے، سونوگرافی، سٹی اسکین اس موقع پر طب جدید کی ایجادات میں ایکسرے، سونوگرافی اور سٹی اسکین بھی قابل ذکر ہیں، ان کے ذریعہ داخلی امراض کا پتہ لگا کر اب ان کا علاج کرنا آسان ہوگیا ہے، یہ ایک اچھی پیش رفت اور قابل قدر کوشش ہے جن سائنس دانوں نے ایسے باریک آلات ایجاد کیے یقیناً وہ تمام مریضوں کے شکریے کے مستحق ہیں کیوں کہ جن داخلی امراض کے علاج کے لیے ڈاکٹر اور مریض دونوں کو طویل اور دشوار مراحل سے گزرنا اور اندھیرے میں تیر چلانا پڑتا تھا، آج ان کی شناخت ایکسرے، سونوگرافی اور سٹی اسکین کے ذریعہ آسان ہوگئی ہے اور اب

ڈاکٹر علی وجہ البصیرت علاج کرتا ہے، جس سے مریض باذن اللہ جلد شفایاب ہوجاتا ہے، اسلام ایسی کوششوں کی مخالفت نہیں کرتا جو انسانیت کے لیے مفید ہوں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن ان میں جہاں یہ مثبت اور مفید پہلو ہیں، وہاں ان جدید ایجادات کے مضر پہلو بھی ہیں جن کی اجازت اسلام نہیں دیتا اور وہ یہ ہے کہ سونوگرافی اور سٹی اسکین کے ذریعہ رحم مادر میں پلنے والے بچے کا پتا قبل از ولادت لگالیا جاتا ہے، چنانچہ یہ معلوم ہونے پر کہ رحم مادر میں بچی ہے تو اکثر والدین آنکھ کھولنے سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور اسقاط حمل یا دواؤں کے ذریعہ اسے ختم کردیتے ہیں، یہ نازیبا حرکت قدرت کی حکمت و مصلحت کے صریحاً خلاف ہے، اس لیے اسلام نہ صرف مخالفت کرتا ہے بلکہ اس کے مرتکب پر حد و تعزیر عاید کرتا ہے، اس کے نزدیک بیٹا اور بیٹی دونوں اللہ کی نعمت ہیں۔

بیٹیوں کے قتل کا یہ کام اہل عرب دور جاہلیت میں رسوائی کے خوف سے پیدائش کے بعد کرتے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے " وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ " (النحل: ۵۸) (ان میں سے جب کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے) لیکن آج کے والدین ان اہل عرب سے بھی زیادہ ظالم ہیں جو پیدائش سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، یہ سائنس اور جدید طب کا اپنے حدود سے تجاوز ہے، اسی لیے بعض حکومتوں نے سٹی اسکین اور سونوگرافی یا M.R.I. پر پابندی بلکہ سزا و تعزیر مقرر کردی ہے۔

۱۰-لیب (Lab) اسی طب جدید کی دین لیب (کیمیائی تجربہ گاہ) ہے، چنانچہ آج انسان کے جسم میں جو بھی بیماری پائی جاتی ہے، اس کے علاج کا انحصار اسی لیب کی جانچ پر ہوتا ہے جب کہ پہلے حکما نبض کے ذریعہ مرض کی تشخیص کرتے تھے، جسے آج جدید سائنس و طب نے زیادہ آسان کردیا ہے، اب اسی کے ذریعہ ڈاکٹر مرض کی تشخیص کرتا ہے، مثلاً انفکشن خون میں ہو یا پیشاب میں تو اس کی سب سے پہلے کلچر پلیٹ کرتا ہے، پھر وہ یہ پتہ لگاتا ہے کہ وہ کس پلیٹ پر (Grow) کرتا ہے، پھر اسے دوسرے پلیٹ میں (Sencitivety) سے پتہ لگاتا ہے کہ کون سی دوا اس مرض کے لیے زیادہ کارگر ہوگی، پھر اس کی روشنی میں ڈاکٹر مریض کی دوا لکھتا ہے، اس طرح لیب مرض کی تشخیص میں جدید طبی ایجاد میں فعال کردار ادا کرتا ہے جو اسلام کی نظر میں محمود و قابل ستایش ہے۔

اخبار علمیہ

عالمی تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں باہمی تہذیبی روابط کے اثرات کے موضوع پر ۱۷، ۱۹؍ جنوری ۲۰۰۳ء کو یک عالمی سمینار شارجہ میں منعقد کیا گیا، جس کا افتتاح سپریم کونسل کے ممبر اور شارجہ کے حاکم جناب ڈاکٹر سلطان بن محمد القاسمی یو-اے-ای- نے کیا، دنیا بھر کے جن فضلا نے اس سمینار کو زینت بخشی، وہ فلسفہ، سائنس اور آرٹ وغیرہ کی ترقی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے اثرات اور دوسری تہذیبوں پر اسلامی ثقافت کے تفوق و امتیاز سے بہ خوبی واقف تھے، افتتاحی تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، امیریکن یونی ورسٹی آف شارجہ کے چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ولفرڈ تھامسن نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں تقریب کے انعقاد پر بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ AUS کو ایک بڑی اہم علمی مجلس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے، اس کے منصوبوں اور مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس یونی ورسٹی نے عربی ثقافت کے حامل تحقیقی ادارے کی ذمہ داری نبھائی ہے اور شارجہ کی تعلیمی ترقی اور اس کے بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل میں ہمیشہ تعاون کیا ہے، IRCICA کے ڈائرکٹر نے AUS سے تعاون اور اس کے تفوق کا تذکرہ کرتے ہوئے ولفرڈ کے بیان کی توثیق کی، ایک اسکالر نے مسلمانوں کی بدنما تصویر کو پرکشش و خوش نما بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ تہذیب اسلامی کی خامیوں کا ذکر کرنے سے احتراز کیا جائے اور تہذیب انسانی کو بنانے اور سنوارنے میں اسلام کی شان دار خدمات اور اس کے ذریں عہد کو نمایاں کیا جائے تاکہ اسلام کے بارے میں بدگمانیوں اور شکوک کا خاتمہ ہوسکے، ان کے نزدیک اس کے لیے تعلیمی، نشریاتی اور اطلاعاتی میدانوں میں سخت اور جاں کاہ محنت کرنا اور ایسی ٹیم تیار کرنا ضروری ہے جو عصری تقاضوں کے مطابق متقدمین مسلم اہل علم و فلسفہ و دانش وروں کی خدمات کو نئے انداز میں پیش کرے تاکہ یہ واضح ہو کہ مسلمان بھی عالمی تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں برابر کے شریک رہے ہیں، اس سمینار کا پہلا مقالہ تیونس کے [illegible] کا تھا جس کا عنوان تھا "انسان کا تصور اور فلسفہ و تہذیب میں اس کا حصہ"۔

۱- [illegible] ۲۰۰۵ء [illegible] آرٹ اینڈ کلچر" استنبول میں

اسلامی آثار قدیمہ" کے موضوع پر پہلی عالمی کانفرنس کا انعقاد کرنے والا ہے جس میں دنیا بھر سے ماہرین اور اسکالرس حصہ لیں گے، اس سے مختلف ملکوں میں عہد اسلامی کی جغرافیائی تحقیقات اور سرگرمیاں سامنے آئیں گی کیوں کہ عہد اسلامی میں بعض مسلم ماہرین جغرافیات نے اس میدان میں بڑی کد و کاوش کی ہے۔

بلغاریہ کے جنوب میں واقع بلگونارنوو کے نزدیک ماہرین آثار قدیمہ نے چھ صدی قبل مسیح کا ایک تباہ شدہ رہائشی مکان دریافت کیا ہے، ماہرین کی اس ٹیم کو دو ڈش (تھالی) اور ایک دیوار ملی جو ان کے خیال میں ۸ ہزار سال پرانی ہے، اس کے علاوہ بعض مٹی کے کوزے اور ایک مذبح کے ساتھ مخطوطے بھی ملے ہیں جن کے متعلق قیاس ہے کہ قربانی کے وقت ان کو پڑھا جاتا رہا ہوگا، ماہرین نے بڑے وثوق سے اپنی رپورٹ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مکان جل کر خاکستر اور تباہ ہوا تھا۔

ماہرین نے چین کے صوبہ ہنین میں واقع شہر یانشی میں بھی بہت قدیم شہر اور شاہی محل کی علامات و باقیات کا کھوج لگایا ہے جو چین کے اب تک کے دریافت شدہ قدیم شہروں میں سب سے پرانا شہر ہے، اس کا مستطیل شاہی محل مشرق سے مغرب جانب میں ۲۰۰ میٹر چوڑا اور جنوب سے شمال میں ۳۶۰ سے ۳۷۰ میٹر لمبا ہے، محل کے چاروں سمتوں میں ۱۰ سے ۲۰ میٹر چوڑے چار راستے ہیں، ان کے اندرونی جانب محل کی دیواریں ہیں، اس سے قدیم عہد شاہی کے طرز تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے۔

اخباری اطلاع کے مطابق جے پور کے گوپال پرساد شرما نے سرسوں کے دانے پر ۹ عالمی مشہور شخصیتوں کی تصویریں بنانے کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ غیر مرئی تصویریں شرما نے بغیر لنس کے بنائی ہیں، اس سے پہلے چاول کے دانے پر مصوری کا مظاہرہ کیا جاچکا ہے لیکن شرما نے اس سے کہیں آگے بڑھ کر مصوری کے لیے سرسوں کے دانے کا انتخاب کیا، ان کے بیان کے مطابق وہ صرف ۱۵ سے ۲۰ منٹ تک اس دانے پر مسلسل کام کر پاتے ہیں، دانے پر جن اشخاص کی تصویریں بنائی گئی ہیں ان کے نام ہیں: گاندھی جی، مدر ٹریسا، بل کلنٹن، مہارانا پرتاپ، شیوا جی، سوائی جے سنگھ، بھیرون سنگھ شیخاوت، پرنسز ڈائنا اور اندرا گاندھی۔

ماہرین آثار قدیمہ کو زمین کے اندر سالہا سال کی قدیم مدفون انسانی نعشوں کے باقیات برابر ملتے رہتے ہیں، چین کی راج دھانی بیجنگ کے بیرونی علاقے جھوؤکوڈیان میں ۱۹۲۹ء میں

سائنس دانوں کو ان کے دعوے کے مطابق پانچ لاکھ سال پرانے مردہ انسانوں کے باقیات ملے تھے، اسی زمانے سے اس پر مطالعہ و تحقیق کا کام جاری ہے، اب تک کے مطالعہ کے نتیجے میں نام نہاد سائنس دانوں کا بدترین اور نہایت بے ہودہ دعویٰ یہ ہے کہ "اس زمین پر انسانوں کا وجود خدا کی دین نہیں ہے" جھوو کوڈیان کے علاقہ میں اب تک اس قسم کے ۴۰ مدفون مردے برآمد کیے جاچکے ہیں جن کو محفوظ کرنے کا کام بھی شروع کیا جاچکا ہے، یونسکو نے ۱۹۸۷ء میں ہی چین کے اس علاقے کو "عالمی آثار قدیمہ کے مخزنوں کی فہرست میں شامل کردیا تھا۔

بنارس ہندو یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مدھولیکا اگروال کا کہنا ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں سے اوزون لہروں کو بچانے کی جو کوشش ہورہی ہے اس کے نتیجے میں لہریں ایک بار پھر بننے لگی ہیں اور اس کے مثبت اثرات سامنے آنے لگے ہیں، اوزون پرت میں سوراخ ہوجانے کے سبب پرا آہنگنی کی بی کرنیں انسانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے جانداروں اور پیڑ پودوں کو بھی متاثر کرتی ہیں جس سے جلدی بیماری کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس خوش آیند انکشاف سے ماہرین حولیات کو توقع ہے کہ پچاس سے ساٹھ برسوں میں سوراخ بھر جائیں گے اور فضا کی اوزون لہریں معمول پر آجائیں گی۔

عالم اسلام کی مشہور سافٹ ویر کمپنیوں میں "حرف" اور "گلوبل اسلامک سافٹ ویر" وغیرہ نے علم حدیث سے متعلق نہایت ہی عمدہ ویب سائٹ تیار کیے ہیں جیسے الفیہ حدیث، اسماء الرجال موسوعۃ الذہب وغیرہ، گلوبل اسلامک سافٹ ویر نے "الکتب التسعہ" کے نام سے چند سالوں قبل جو سافٹ ویر تیار کیا تھا اور جس سے تشنگانِ تحقیق ۱۹۹۷ء سے فیضیاب ہورہے ہیں، اب اس پروگرام کو متعدد سافٹ ویر کمپنیوں نے مل کر مزید بہتر بنادیا ہے، الکتب التسعہ سافٹ ویر سے فایدہ اٹھانا نہایت آسان ہے، اس پروگرام میں تین معاجم: ۱- معجم الفاظ حدیث ۲- معجم غریب الفاظ حدیث ۳- معجم مبہمات الحدیث، فہارس المصادر کے تحت اعلام، اماکن، قرآنی ایات، اشعار، اقوال اور رواۃ وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرائی گئی ہیں، عام خوبیوں کے علاوہ اس کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل کتب حدیث کے مولفین کے سوانح اور ان کی کتب کی نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور احادیث کی درجہ بندی کے لحاظ سے سرچ کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

ک۔ص۔اصلاحی

آثار علمیہ وادبیہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ ☆
بنام
سید غلام محمود شاہ نشترؒ (گونڈواکڑی)

پاریس
۱۴ر جمادی الاول ۱۳۸۴ھ

بحوالہ ۳۲۹/۶۰

مکرمی سلام مسنون

یہاں غریبانہ زندگی کے لیے آج کل کم از کم چھ سو ماہوار کی ضرورت ہے۔

یہاں عربی پڑھنے والے لزیادہ تر یہودی اور عیسائی ہیں، میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید کے پانچ سال میں الحمد للہ پانچ اڈیشن نکلے ہیں، میں نہ یہاں پڑھتا ہوں نہ پڑھاتا بلکہ صرف رہتا ہوں۔

انڈا چھ سات آنے میں ایک ملتا ہے، گوشت ہر قسم کا ملتا ہے، مسلخ کا ایک شعبہ مسلمان قصابوں کے لیے ہے، جس کو اتنی آمدنی ہو کہ ملازم کو چھ سو ماہوار دے سکے تو وہ ملازم رکھتا ہے، ورنہ اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے۔

مجھے اب تک تو داڑھی ہے، یہاں صرف ایک مسجد ہے، شہر میں نصف ملین مسلمان ہیں، امام الجزائری ہیں، نمازیں پنج وقتہ ہوتی ہیں، تراویح بھی ہوتی ہے، میں سگریٹ نہیں پیتا نہ چائے کافی، مجھے نہیں معلوم ان کی کیا قیمتیں ہیں، ایک پیالی چائے بارہ آنے ایک روپے سے کم نہ ہونی چاہیے۔

آپ کی تحریر میں املا اور صرف و نحو کی کئی غلطیاں نظر آئیں، ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔

خدا ہم سب کو نیک ہدایت دے، آیندہ مجھے غیروں کے پتے پر نہ لکھیے۔

م۔ح

☆ ڈاکٹر صاحب کا یہ گرامی نامہ ہمیں مکتوب الیہ کے صاحب زادے سید شاہ فضل الرحمن نادر گونڈواکڑی ضلع ایوت محل مہاراشٹر نے بھیجا ہے جو ان کے شکریے کے ساتھ شایع کیا جارہا ہے، مکتوب الیہ کی دو کتابیں ماتم برار ۱۹۴۲ء میں اور شادی یا بربادی ۱۹۶۲ء میں معارف پریس اعظم گڈھ سے شایع ہوئی تھیں۔ (ض)

باب التقریظ والانتقاد

A QUEST FOR TRUTH

مبصر:- ڈاکٹر جاوید علی خان ☆

از:- ڈاکٹر زیڈ-اے- ڈیسائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۹۵، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ، درگاہ شریف ٹرسٹ، احمد آباد، گجرات۔

ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحیٔ ڈیسائی ایک ممتاز عالم، دانش ور اور مشہور مورخ و محقق تھے، ان کی تحقیق و تلاش کا اصل میدان کتبات تھا، فارسی زبان پر انہیں عبور تھا، بمبئی یونی ورسٹی سے اس میں ایم اے کیا اور تہران یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی، مرحوم کے تعلیمی سفر کا آغاز فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا تھا اور کئی کالجوں میں درس کی خدمت پر مامور رہے، پھر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سے وابستہ ہوئے اور اس کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں کے دوران بھی مرحوم ڈیسائی صاحب نے اپنے مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا، انہوں نے بیرونی ملکوں کے سفر بھی کیے، ان کا مطالعہ بہت وسیع اور تحقیق کا معیار بلند تھا جس کا اندازہ ان کی بیش قیمت اور معلومات افزا کتابوں اور سیکڑوں عالمانہ مقالات سے ہوتا ہے، مرحوم کی تصنیفی زبان انگریزی تھی، گوناگوں علمی و تحقیقی خدمات کی بنا پر ان کو بہت سے ایوارڈ بھی ملے۔

ضیاء الدین مرحوم کو خطاطی، مصوری اور پینٹنگ وغیرہ سے بھی دل چسپی تھی، وہ سکوں کی شناخت اور مخطوطہ شناسی کے ماہر تھے، ان پر اور دوسرے موضوعات پر ان کے مضامین کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ بھی محققانہ مقالات پر مشتمل ہے جس میں عہد وسطیٰ کی چند مثنویوں اور

☆ رفیق اعزازی دار المصنفین و صدر شعبۂ تاریخ شبلی نیشنل ـــ ڈگری کالج، اعظم گڈھ۔

دیواروں اور محرابوں اور مقبروں وغیرہ پر ثبت کتبات کی مدد سے بڑی مفید اطلاعات فراہم کی گئی ہیں، گجرات کے علاقے کے کتبات خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں جن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے، ان مثنویوں اور کتبات کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ان میں وہ معلومات ہیں جو اس عہد کی تاریخوں میں نہیں ملتے چنانچہ مطیعی کی مثنوی گنج المعانی سے گجرات میں بہادر شاہ کی فتوحات اور اس کے دوسرے کارناموں اور دولت عثمانیہ اور گجرات کی حکومت کے ان اقدامات کا پتا چلتا ہے جو پرتگالیوں کے حملوں کو روکنے کے لیے انہوں نے کیے تھے، ان کی فوجی قوت اور بحری جنگوں کا حال بھی ان میں ملتا ہے، اسی طرح گجرات کے بعض علاقوں کی مسلم آبادی کے متعلق جو اطلاعات اس میں ملتی ہیں، وہ دوسرے ذرائع سے نہیں مل سکتیں۔

مجموعے کا دوسرا مقالہ احمد آباد کی اہم درگاہوں کے بارے میں ہے، یہ درگاہیں جن اشخاص سے منسوب ہیں ان کے حالات بھی دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، شیخ احمد کھٹو اور سید برہان الدین قطب عالم کی درگاہوں کے بارے میں خاص طور پر بہت مفید معلومات درج ہیں، مرأۃ سکندری پر جو مقالہ قلم بند کیا گیا ہے اس سے گجرات کے تہذیبی و معاشرتی حالات کی عکاسی ہوتی ہے، اس سے اس دور کے سلاطین کے حالات زندگی، حکومت کے نظم و نسق، ذاتی دل چسپیوں، اسلحہ جات، عسکری نظام، اولوالعزمی، ہندو اور جین مذاہب کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری، ہندوؤں کو اہم عہدوں پر فایز کرنے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب اور گجرات کے زرعی و اقتصادی حالات وغیرہ کے بارے میں مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے ایک اہم مقالے میں مآثر محمد شاہی کے مصنف کی صحیح تعیین کی گئی ہے، فاضل مقالہ نگار کی تحقیق میں ملا عبدالحسین طوفی اس کے مصنف تھے جو بیگڑہ کے دربار سے وابستہ تھے، فاضل مصنف کا یہ امتیاز بھی ہے کہ انہوں نے جا بجا اغلاط کی تصحیح اور شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کیا جیسے ملا صاحب کے بارے میں ریو اور اسٹوری کے بیان کی تردید کی ہے، اسی طرح گجرات کے جن مقامات کی شناخت اور تعیین کے بارے میں لوگوں کو جو مغالطہ ہوا ہے اس کو مرحوم ڈیسائی صاحب نے دور کیا۔

اس قیمتی مجموعے کی اشاعت پر درگاہ پیر محمد شاہ کے ذمہ دار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

مطبوعات جدیدہ

قاموس المشاہیر جلد اول ودوم : از جناب نظامی بدایونی مرحوم، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: جلد اول ۳۳۲ و دوم ۳۰۰ قیمت بالترتیب: تین تین سو روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴۔

قریب پون صدی قبل مولوی نظام الدین بدایونی نے قاموس المشاہیر مرتب کرکے اردو زبان میں پہلی بار سوانحی قاموس کی ابتدا کی تھی، دس سال کی تحقیق ومحنت کے نتیجے میں انہوں نے تن تنہا تاریخ انسانی کے چھ ہزار اشخاص وافراد کے متعلق ضروری معلومات جمع کردیے تاکہ ان کے حالات سے بہ آسانی واقفیت ہوسکے، کتاب کی افادیت اس کے موضوع ہی سے ظاہر ہے، وہ مقبول ہوئی اور قدر کی نظر سے دیکھی گئی، مولف مرحوم نے طبع اول کے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ایک "کمزور کوشش واحد" کا نتیجہ ہے، آیندہ اس کا نقش ثانی اگر کسی زبردست قوت سے تیار کیا گیا تو یقیناً وہ زیادہ مکمل ہوگا لیکن پون صدی کے بعد بھی اس کی توسیع وتکمیل کے لیے کسی اور حوصلہ مند نظامی کا انتظار ہی ہے، اس عرصے میں یہ بیش قیمت سرمایہ بھی گردش زمانہ کی نذر ہوتا جاتا تھا، اس کی جدید اشاعت کی ضرورت تھی اور شکر ہے کہ خدا بخش لائبریری نے اس ذمہ داری کو قبول کیا، زیر نظر دونوں جلدیں کتب خانہ خدا بخش کے نام وکام کی نیکی میں اضافہ کا باعث ہیں، طبع اول میں کتابت اور مضمون کی غلطیاں تھیں اور خاصی تھیں، ان کی نشان دہی ایک غلط نامہ کے ذریعہ کی گئی تھی، اب ان کی اصلاح اصل مقام پر کردی گئی، اسی طرح خود مولف نے بعد میں جا بجا اصلاح وتصحیح کی تھی، اس کو اور جناب امتیاز علی عرشی مرحوم کی اصلاحات کو بھی اس طبع جدید میں شامل کردیا گیا ہے، قاموس المشاہیر کی اشاعت اول کے بعد اس کی تنقید کے نام سے جناب احمد اللہ قادری کا ایک رسالہ شائع ہوا تھا اور یہ سنجیدہ علمی تنقید کا بہترین نمونہ مانا گیا تھا، زیر نظر دونوں جلدوں میں بہ طور ضمیمہ یہ رسالہ بھی شامل کردیا گیا ہے ان خوبیوں کی وجہ سے یہ طبع جدید اور زیادہ مفید ومستند ہوگیا ہے، مولوی نظامی

مرحوم نے غلطیوں کے بارے میں خود ہی لکھا تھا کہ قاموس یا موسوعہ کی ترتیب کا عمل، شخص واحد کا کام نہیں، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اصلاح ودرستگی کا کام بھی ایک دو اشخاص کے بس کی بات نہیں، زیر نظر دونوں جلدوں میں اب بھی کتابت کے علاوہ اعلام وسنین کی تصحیح کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر قاموس کے پہلے صفحہ پر ہی آتش کے ذکر میں ان کا سال وفات ۱۲۶۳ھ لکھا ہے جس کی غلطی ظاہر ہے، شاہ ولی اللہ کے سامنے قوسین میں لکھا ہے (ملاحظہ ہو اشتیاق) لیکن اس اشتیاق کا کہیں ذکر نہیں، حرف آغاز میں احمد اللہ قادری کو شمس اللہ لکھا جانا بھی تسامح ہے، مولوی بدایونی مرحوم نے آخری گزارش میں اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ "وقتاً فوقتاً اس کے مرتمہ نسخے شائع ہوتے رہیں گے" خدا بخش لائبریری نے پون صدی بعد ان کی اس خواہش کو جس سلیقے اور خوبی سے پورا کیا ہے، یقیناً وہ داد اور پوری دنیا کی جانب سے شکریے کی مستحق ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو، ایک مطالعہ : مرتبہ جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۶۵، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۲۔

اردو کے متقدمین شعرا میں خان آرزو کا نام نمایاں ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ فارسی زبان وادب کے نابغہ عالم تھے، لسانیات، تنقید، تذکرہ اور فرہنگ نویسی میں ان کی شخصیت واقعی بے مثال تھی، ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے بھی فاضل تھے، اس لحاظ سے معاصرین پر ان کا امتیاز ظاہر ہے، بہ قول پروفیسر نذیر احمد خان آرزو پہلے عالم ہیں جنہوں نے فارسی اور سنسکرت اور فارسی وعربی کے ہم رشتہ ہونے کی بنیاد پر توافق لسانین کا نظریہ پیش کیا، یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے فارسی زبان میں ہندی الفاظ کے استعمال کے جواز کی وکالت کی اور دلیل بھی ان کی قوی رہی کہ جب عربی، ترکی اور ارمنی زبانوں کے الفاظ، فارسی میں بے تکلف مستعمل ہیں تو ہندی کے لیے تکلف کیسا؟ ایسے منفرد صاحب فکر کی شخصیت اور خدمات سے اگر بے اعتنائی کی شکایت ہو تو بالکل بجا ہے، شاید اسی احساس کے تحت غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایک سمینار کا انعقاد کیا، زیر نظر کتاب، مذاکرہ علمی کے گیارہ مقالات پر مشتمل ہے، شخصیت کے علاوہ اس میں ان کی تصانیف غرائب اللغات، نوادر الالفاظ، تنبیہ الغافلین،

مجمع النفائس، قصائد عرفی اور اردو شاعری اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کا مفصل جائزہ آگیا ہے، ایک مقالہ علی حزیں سے ادبی معرکہ آرائی پر ہے، پروفیسر نذیر احمد کا مقالہ سرفہرست ہے اور فاضل گرامی کی ہر تحریر کی طرح نہایت محققانہ ہے، انہوں نے لکھا کہ آرزو کو فارسی لغت نویسی اور قواعد فارسی کا موجد کہنا بے جانہ ہوگا، ان سے پہلے کسی فاضل نے ان فنون پر کوئی کتاب نہیں لکھی، قواعد زبان کے سلسلے میں مجہول آوازوں کے تعلق سے قواعد اور لہجے کا فرق، زبان دانوں کا خاص موضوع رہتا ہے، آرزو نے بھی اس موضوع پر گفتگو کی اور رشید حسن خاں کے الفاظ میں ایسی گفتگو وہی کرسکتا ہے جو زبان شناس ہو، مختصر ہونے کے باوجود رشید صاحب کی تحریر بڑی وقیع ہے، باقی تحریریں بھی بلند پایہ اور خان آرزو کے مرتبہ علمی کے شایان شان ہیں۔

داستان غدر یا طراز ظہیری : از ظہیر دہلوی، مقدمہ وپیش کش: پروفیسر افغان اللہ خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۴۳، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: ادبی مرکز، نزد جامع مسجد، گورکھ پور اور دانش محل لکھنؤ و مکتبہ جامعہ دہلی۔

دہلی کے سید محمد ظہیر الدین حسین رضوی کی یہ تالیف اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں ۱۸۵۷ کی پہلی تحریک آزادی کے حالات کا چشم دید بیان ہے، اس واقعہ کے متعلق اس کتاب کے بیانات کو جس طرح نظر انداز کیا گیا، فاضل مقدمہ نگار کے نزدیک یہ بڑے تعجب کی بات ہے، حقیقت بھی یہی ہے، ظہیر کی آمد ورفت، قلعہ معلی میں آٹھ سال کی عمر سے ہی تھی، تیرہ سال کے ہوئے تو ان کو داروغہ ماہی مراتب کے عہدے سے سرفراز کیا گیا، ان کو بہادر شاہ ظفر کی مصاحبت اور ذوق کی شاگردی نصیب ہوئی، ان کی یہ خودنوشت قلعہ معلی کے حالات اور دہلی مرحوم کی تباہی کے بعد ریاست رام پور، الور، جے پور، ٹونک اور حیدر آباد دکن کے درباروں سے وابستگی کے واقعات پر مشتمل ہے اور اس دور کی سیاسی تاریخ کے علاوہ تہذیبی اور سماجی زندگی کا ایسا مرقع ہے جس میں حیرت اور عبرت کے تمام عناصر موجود ہیں، یہ کتاب بیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہوئی تھی اور اب یہ تقریباً نایاب ہوچکی تھی، فاضل مقدمہ نگار نے ایک مفصل اور جامع مقدمہ لکھ کر اس کی جدید اشاعت کا اہتمام کیا، یہ قابل قدر کوشش ہے، کتاب میں فہرست مضامین کی ضرورت تھی، تاریخ کے ایک باب کے علاوہ زبان کے لطف کے لحاظ سے بھی اس کا مطالعہ پر کیف ہے۔

ع۔ص